شفیق انجم

اسلوب

میں + میں

(افسانے)

شفیق انجم

اُسلوب، اسلام آباد

انتساب

اُس کے نام

کہ جو……

میرا نہیں ہے —— ہے بھی

فہرست

پیش لفظ

شفیق انجم جدید اُردو افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اکیسویں صدی میں اُردو افسانے کو نئے رنگوں سے آشنا کرنا ہے۔ ان کے فنی شعور نے اُس وقت آنکھ کھولی جب جدید افسانہ کئی انتہائی اور درمیانی منزلوں سے گزر کر اپنی پہچان بنا چکا تھا۔ جدید اُردو افسانے کے آغاز میں دروں بینی اور شناخت کے موضوعات کے ساتھ ساتھ بعض اوقات گنجلک علامتی نظام نے ابلاغ کے جو مسائل پیدا کیے تھے وہ ایک تو قاری کی نئے ادب سے نامانوسیت اور دوسرے خود لکھنے والوں کی فنی مشق و مہارت کے ساتھ ساتھ خود بخود ختم ہو گئے۔ ستر کی دہائی میں عوامی تحریک کی تازہ ہوا نے دروں بینی کو خارجیت کے نئے ذائقوں سے آشنا کیا، شناخت جو ذاتی تشخص تک محدود ہو گئی تھی، وسیع معنوں سے متعارف ہو کر قومی اور پھر پوری کائنات میں اپنی پہچان سے عبارت ہوئی۔ اسّی کی دہائی اور بعد میں طویل عرصہ تک مزاحمتی ادب نے جدید اُردو افسانے کو اپنے سیاسی سماجی منظر نامے سے پوری طرح جوڑے رکھا۔ اس دور کا افسانہ فنکار کا احتجاج بھی ہے اور اپنے عہد کی تاریخ بھی۔

جدید اُردو افسانے کے ان تمام موڑوں نے کہانی کو متنوع رنگوں اور زاویوں سے ہم آہنگ کیا۔ شفیق انجم جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں اسے ورثہ میں جدیدیت کی ایک واضح، نکھری ہوئی مضبوط روایت ملی ہے۔ اس روایت میں سیاسی سماجی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ باطنی دنیا اور اس کا پُر اسرار سرمئی دھند میں لپٹا سفر بھی ہے، جس کی غواصی خود شناسی کے ایک

ایسے عمل سے گزرنا ہے جس کے نتیجے میں اب جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں ایک نئی مابعد الطبیعات کی تعبیر اور اس کی تفسیر کے تحت انسان کی شناخت، کل اور جُز، کے نئے معنی دریافت کرنا ہیں۔ شفیق انجم کی کہانیوں میں یہ سارے مسائل فنی جمالیات کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی کہانیاں ایک طرف تو اپنے سیاسی سماجی منظرنامے سے جنم لیتی ہیں تو دوسری طرف ان کا ایک اہم مسئلہ فرد کی شناخت کا بھی ہے۔ لیکن یہ شناخت یک پہلو یا یک سطحی نہیں بلکہ نئے سائنسی انکشافات کے نتیجہ میں فرد اور کائنات کے جن رشتوں کا تصور ابھرا ہے اس کے بارے میں ایسے غور و فکر پر مشتمل ہے جس میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبہ بھی شامل ہے۔ یعنی مادیت و روحانیت کے سنگم پر ایک ایسے انسان کی شناخت کا سفر درپیش ہے جو جدید عہد کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے روحانی ورثہ سے بھی متصوف ہے۔

شفیق انجم کے افسانے موضوعاتی طور پر بہت پہلودار اور دبیز ہیں۔ اس کے لیے ان کے اُسلوب نے بڑی معاونت کی ہے جس میں نثری خوبیوں کے ساتھ ساتھ شعری وسائل سے بھی بھرپور کام لیا ہے۔ تہہ دار اور پیچیدہ مسائل کا اظہار سادہ بیانیہ میں ممکن نہیں، اس کے لیے جس اُسلوب کی ضرورت ہے وہ شفیق انجم کے یہاں نہ صرف موجود ہے بلکہ وہ اسے فنی نزاکتوں کے ساتھ استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

'میں+میں' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کا نام ہی معنی خیز اور توجہ کھینچنے بلکہ غور و فکر کی دعوت دینے والا ہے۔ اس مجموعے کی کئی کہانیاں مختلف رسائل میں چھپ کر اہلِ فکر و فن سے تحسین پا چکی ہیں۔ اب یکجا صورت میں ایک تسلسل میں پڑھنے سے ان کی معنویت کی نئی نئی پرتیں وا ہوں گی۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے جو ان کے آئندہ سفر کی سمت کا تعین کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شفیق انجم مستقبل میں ایک منفرد کہانی نگار کے طور پر اپنی پہچان بنا لیں گے۔

رشید امجد

اسلام آباد

۲ر اپریل ۲۰۰۸ء

دیباچہ

گذشتہ ایک صدی میں افسانے کی صنف نے نہ صرف یہ کہ بے پناہ مقبولیت حاصل کی بلکہ اُسلوب اور تکنیک کی سطح پر نت نئے تجربات کے عمل سے بھی گزری۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُردو افسانہ اپنے دامن میں ایسی بے پناہ وسعت رکھتا ہے کہ کسی بھی نئے آنے والے کو اظہار کی دشواری کا گلہ نہیں ہوسکتا۔ ہزار رستے ہیں، یہ نئے لکھنے والے کی اپنی توفیق پر ہے کہ وہ کس راہ کو اختیار کرتا ہے اور پھر اس میں سے اپنی منزل کس طرح کھوجتا ہے۔ شفیق انجم اکیسویں صدی کا ایک ایسا ہی ذہین تخلیق کار ہے جسے اس صنف کی وسعتوں کا بخوبی ادراک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ابتدا میں ہی اپنے سفر کا آغاز وہاں سے کرنا چاہا ہے جہاں یہ صنف ارتقا کر کے پہنچی ہے اور میں اس بات کی شناخت اس کے اُسلوب اور تدبر کرتی تخلیقی ذات سے بخوبی کرسکتا ہوں۔

یہ بہت کم ہوتا ہے کہ آغازِ سفر پر ہی کوئی لکھنے والا اپنی ذات سے ہمکلامی کا روگ پالے اور اپنے ہونے کے معانی تلاش کرنے کے راستے پر گامزن ہو جائے۔ شفیق انجم نے یہ کیا ہے۔ نو واردان عام طور پر اپنے گرد وپیش کی زندگی کے خوشنما رنگوں کو سمیٹتے ہیں یا بدہیئتوں پر کڑھتے ہیں، اپنے ہونے کی الجھن ذرا بعد میں ابھرتی ہے اس لیے کہ یہ ایک خاردار راستہ ہے جس کی اپنی دشواریاں ہیں اور اپنا کرب ہے مگر وہ اس کرب سے گزرنے پر مصر دکھائی دیتا ہے۔ میں + میں، منجمد لمحوں کا سفر، گم شدگی، عنواں اور دیگر کئی افسانے ذات

کی تلاش اور شناخت کے اسی کرب کی مختلف صورتیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے پاس ایسی کہانیاں بھی زیادہ اکٹھی ہوگئی ہیں جو افسانہ لکھنے کے تخلیقی عمل کو موضوع بناتی ہیں:

''وہ ہر روز ایک افسانہ لکھتا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جب سب سو جاتے تو وہ اٹھ بیٹھتا۔ کاغذ قلم سنبھالتا اور لکھنا شروع کر دیتا۔ لکھتا جاتا اور کاٹتا جاتا، کاٹتا جاتا اور لکھتا جاتا۔ کہانی ختم ہوتی تو غبار اترتا۔ لیکن عجب تھا کہ اگلے ہی لمحے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ کہانی تو وہیں کی وہیں ہے۔ جو لکھنا تھا وہ تو لکھا ہی نہیں گیا۔ غبار پھر ویسے کا ویسا ہو جاتا۔''

(ٹیڑھی میڑھی دھند لکیریں)

یہ شکوہ اس کے ہاں بار بار ابھرتا ہے کہ کہانی اس کی گرفت میں نہیں آتی۔ بس کاغذ پر لفظ اور نقطے اور لکیریں رہ جاتی ہیں، وہ غبار نہیں اترتا جو کسی دکھ کا پیدا کردہ ہے۔

''کہانی تھوڑی دیر کے لیے آغاز ہوتی اور گم ہو جاتی ہے۔''

(گھنی سیاہ رات)

''سوچ گم ہے، بولنے والا چپ ہے اور مایوسی کے گدھ ہیں کہ قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں——''

(چلمنوں کے اس پار)

''آج کچھ بھی تو نہیں لکھا جا رہا، کل بھی کچھ نہیں لکھا تھا——''

(پہلی اور آخری کہانی)

عدم اظہار کی یہ کیفیت عجز بیان کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ ہر اس فنکار کے ہاں پیدا ہوتی ہے جو لفظوں کی نئی تفہیم کا طلبگار ہوتا ہے۔ شفیق انجم بھی یوں لگتا ہے جیسے پہلے سے موجود صورت حال کے پس منظر میں جھانکنے کی خواہش رکھتا ہے اور یہی اس کا تخلیقی کرب ہے۔

شفیق انجم نے اپنا سفر کسی واضح نظریاتی پس منظر کے ساتھ شروع نہیں کیا ابھی اس کے سامنے حیرت کا سمندر ہے، راستے الجھے ہوئے ہیں اور منزل واضح نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

اس کی ذات ابھی کسی 'بابے' کے گرد گھومتی ہے اور زندگی کی تفہیم کے لیے ملتجی رہتی ہے۔ اس کے اکثر افسانوں میں تین کردار بڑے تواتر سے ابھرتے ہیں۔ کوئی خوشنما چہرہ، ماں کا دستِ شفقت اور کسی بزرگ کی رہنما باتیں ــــ یہ وہ اثاثہ ہے جس کی مدد سے وہ اپنے لیے کسی راستے کو ٹٹولتا ہے مگر آغاز سفر پر یہ راستہ ابھی دائرے کی شکل میں ہے۔ گھومتا ہے مگر کسی نقطے پر مرکوز نہیں ہوتا۔

شفیق انجم کی کہانیوں کا سماجی معاشرتی پس منظر وہی ہے جس میں ہم سب رہتے بستے ہیں...... وہی غلاظت سے بھری گلیاں، تنگ و تاریک گھر اور زندگی کے عذاب سے ستائے ہوئے لوگ...... لوگ جو نسل در نسل خوشنما خواب دیکھتے آ رہے ہیں مگر تعبیر ان کے مقدر کا حاصل نہیں۔ ہر حساس فنکار کی طرح وہ بھی تقدیر کے اس عمل پر کڑھتا ہے، کراہتا ہے مگر ابھی اسے یہی معلوم ہوا ہے کہ ایسا تھا، ایسا ہے اور ایسا ہی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی کہانیوں میں وہ اکثر زندگی کے اس یک رخے عمل سے دور ہو کر کبھی کبھی اپنے اندر پناہ لینے میں آسودگی محسوس کرتا ہے۔ غور کرنا اور پھر نہ پا سکنے کا کرب اکثر اس کی کہانیوں میں محور بنتا ہے اور ان لفظوں میں سامنے آ جاتا ہے:

> ''...... برس ہا برس سے عذاب جھیلنے والے آ جا رہے ہیں سو آتے جاتے رہیں گے۔ کہانی سینہ بسینہ چلتی رہی ہے ــــ چلتی رہے گی ــــ دریا بُرد ہوتی رہے گی۔ جاننے والو! نہ جاننے والوں کو بتا دو اور نہ جاننے والو چُپ ہو رہو...... چُپ ہو رہو کہ دو پہاڑوں کے بیچ ہولناک بلندیوں پر ہوا میں ڈولتے پُل پر سب برابر ہے...... جاننا نہ جاننا سب برابر ہے۔''

(دریا بُرد ہوتی کہانیاں)

شفیق انجم کو اُسلوب سازی سے خصوصی دلچسپی ہے۔ اس ضمن میں وہ علامت سے بھی کام لیتا ہے اور تمثیل سے بھی...... جبکہ جملہ سازی میں شعری عناصر سے کام لینا بھی اس کے مخصوص ذوق کی شناخت ہے۔ چند بڑی علامتوں کا ذکر تو اس سے قبل ہوا جن میں

ماں اور بابا شامل ہیں۔ یہ دونوں کردار اسے اپنے وجود کو سمجھنے کے لیے درکار تھے۔ لیکن اس نے بعض دیگر اشیاء سے بھی علامتی مفہوم اخذ کیا ہے۔ مثلاً اپنے ایک افسانے 'دریا بُرد ہوتی کہانیاں' میں اس نے 'پُل' کو ایسی علامت کے طور پر پیش کیا ہے جو جانے اور نہ جانے کے درمیان واقع ہے۔ اسی طرح وقت اور کہانی بھی اس کے افسانوں میں علامتی مفہوم کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ وقت جو خود ایک کہانی ہے—— ایک ہی کہانی جو بیان ہونے میں ہی نہیں آتی۔

شفیق انجم کا اُسلوب قدرے شاعرانہ ہے۔ وہ رومانیت اور جذباتی تموج جو اس کی فکر میں گھلے ہیں اس کے اُسلوب کا بھی حصہ بنے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کے اُسلوب پر ابھی گذشتہ اور معاصر اسالیب کی پرچھائیاں بھی گہری ہیں لیکن وہ اپنے الگ راستے کی تلاش میں ہے بالکل اسی طرح جس طرح وہ زندگی کی تفہیم کی تلاش میں ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تدبر اس کی تخلیقیت کی بنیاد ہے۔ وہ سوچتا ہوا فنکار ہے اور اس کی یہ کہانیاں محض کہانی لکھنے کے شوق میں سرزد نہیں ہوئیں۔ انھیں سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

احمد جاوید

اسلام آباد

۱۱ر جون ۲۰۰۷ء

افسانے

میں + میں

ہیولا میرے سامنے چت لیٹا ہوا ہے اور میں منتظر ہوں کہ وہ کچھ کہے۔ برسوں کی بانجھ امیدوں پر آج ہرے پات لگے ہیں اور اک عمر سے منجمد خوابوں میں دھوپ لہرائی ہے۔ اک دھمک اور ارتعاش سا بدن میں تلملا رہا ہے اور میں گمان کرتا ہوں کہ شاید بجھے ہوئے چراغوں میں دوبارہ سے کوئی روشنی جی اٹھے۔ سو میں منتظر ہوں کہ وہ کچھ کہے۔ کشٹ کاٹتے کاٹتے صدیاں بیت گئیں، ایسی مشقتیں کہ چٹانوں پر بھی وارد ہوتیں تو انھیں قطرہ قطرہ بہا لے جاتیں۔ مجھ بدنصیب کی قسمت میں تو یہ بہہ جانا بھی نہیں۔ ہمیشہ سے یہی ہوا ہے کہ خاک ذروں کی مانند ریزہ ریزہ ہوتا ہوں، قریہ قریہ روندا جاتا ہوں اور جب امید بندھ چلتی ہے کہ رہائی کی منزل قریب ہے تو پھر سے قید کا ایک نیا سلسلہ آغاز ہو جاتا ہے۔ جبر کے عفریت کے کھردرے کٹیلے ہاتھ تھکتے ہی نہیں، بس گوندھے چلے جاتے ہیں اور گاچنی مٹی کی طرح میں بل پہ بل کھاتا گندھ رہا ہوں۔ اک بے طرح گھماؤ کہ جو رکتا ہے نہ تھمتا ہے، عفریت کی بے رحم انگلیاں بھی نہیں چٹختیں اور نہ مجھ میں یہ حوصلہ آتا ہے کہ جست لگا کر ایک طرف ہو جاؤں اور سینہ تان کے اپنے مزید گندھے جانے سے انکار کر دوں۔ آہ افسوس کہ میں ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بس ایک منحنی سی سوچ ابھرتی ہے اور دب جاتی ہے۔ لفظ اندر ہی اندر انگڑائی لیتے ہیں اور دھت ہو جاتے ہیں۔ ہونٹ جگالی کرتے اور جم جاتے

ہیں...... میں ایک نظر ہیولے کو دیکھتا ہوں اور شدت کرب سے آنکھیں میچ لیتا ہوں۔ خواہش سر پٹختی ہے کہ میں اپنا آپ سارے کا سارا اس کے سامنے پھیلا کر اور اس کو اپنے اوپر پورے کا پورا اوڑھ کر اُسے ہی تک ازلوں ازلی ان کہی اگال دوں لیکن لفظ اندر ہی اندر ڈوب رہے ہیں۔ برف کی سلیں سی میرے وجود کو یخ کرتی ہوئیں سوچ کے آر پار ہو رہی ہیں اور میں منجمد آنکھوں کے ادھ کھلے کناروں سے چپ چاپ اسے تکے چلا جاتا ہوں...... بس تکے چلا جاتا ہوں۔

یہ ایک بڑے اور کشادہ کمرے کا منظر ہے۔ کمرے کا دروازہ بند ہے اور کھڑکیوں پر پردے پڑے ہیں۔ روشنی تیز ہے نہ بہت مدھم۔ ریکارڈ بج رہا ہے اور سُروں کا دھیما ارتعاش چاروں اور پھیلا ہوا ہے۔ آتش دان میں انگارے دہک رہے ہیں اور ان سے اٹھنے والی البیلی تپش ماحول کو خوشگوار بنا رہی ہے۔ ایک طرف موتیے اور گلاب کے تازہ پھول سجے ہیں۔ بھینی بھینی خوشبو پتیوں سے نکل کر در و دیوار پر بوسے ثبت کرتی اور روشندانوں کے اُس پار اتر جاتی ہے۔ ہر ہر چیز بہت قرینے اور سلیقے سے ترتیب دی گئی ہے، ایسے کہ نظر ہزار بار دیکھنے پر بھی نہ تھکے۔ باہر یقیناً رات ڈھل چکی ہے لیکن کمرے کے اندر وقت کی ٹک ٹک رات اور دن کے بین بین گویا کہ تھم سی گئی ہے۔ اداس لمحے ایک طرف بیٹھے اونگھ رہے ہیں اور ان پر ماحول نے چپکے سے سفید چادر ڈال دی ہے۔ فرش پر بچھے قالین پر سناٹا بکل مارے بیٹھا ہے اور بہت سنبھل سنبھل کر پہلو پہ پہلو بدلتا ہے مبادا کہ کوئی آواز ابھرے۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ نفیس صوفہ دھرا ہے اور دوسری طرف بڑا اور گداز ریشمی کپڑے میں مغلف بیڈ ہے۔ بیڈ کے چاروں طرف دھندلے دائروں کی لطیف دیواریں سی محوِ رقص ہیں اور ان کے بیچوں بیچ میں اور وہ اک خمار گھلے اضطراب کے ساتھ ایک دوسرے کے منتظر ہیں۔ ہیولے کی آنکھیں چھت کے منقش زاویوں میں کچھ ٹٹول رہی ہیں۔ چہرہ متغیر ہے اور سوچ کے لہریے بار بار بن بگڑ رہے ہیں۔ سانسوں کے ردھم میں بے چینی ہمک رہی ہے اور وقفے وقفے سے ایک لمبی

اور گہری آہ سی اس کے حلق کی دیواریں پھاندتی ہوئی ابھر آتی ہے۔ میری طرح ذرا پل کو اس کے ہونٹ بھی پھڑ پھڑاتے ہیں، چہرے پر کچھ رنگ سے جھلملاتے ہیں، آنکھوں میں اک چمک سی اترتی ہے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے...... انجماد سانسوں میں اتر کر لفظوں کو اچک لیتا ہے، کہر پھیل رہا ہے، مسلسل پھیل رہا ہے۔ ہم بے بسی سے ایک دوسرے کو تکتے ہیں، خوب خوب تکتے ہیں اور مضطرب ہو کر نظریں چرا لیتے ہیں۔

اس کی آنکھیں...... آہ اس کی آنکھیں کہ اک وجد آور چھلکتی کشش سے لبالب بھری ہوئی ہیں اور اس کے ہونٹ کہ جن سے قطرہ قطرہ شیریں رس نچڑتا دکھائی دے اور اس کے گال اور چہرہ اور مرمریں بدن کہ جس کو ہوائے بہاری چھو کر گزرے تو مدتوں رشک کرے۔ اک کنواری کونپل کہ جو اپنے شباب سے بے نیاز دریا کنارے جھوم رہی ہو یا قوسِ قزح کی اک نکھری قاش کہ بادلوں کے پاکیزہ کندھوں پر بیٹھی گنگناتی چلی جائے یا وائلن کے تاروں سے نکلتی اک مدھر تان کہ سماعتوں میں اتر اتر رقص کرے۔ میں اسے لفظ لفظ پڑھنا، سطر سطر جذب کرنا اور حرف حرف لکھنا چاہتا ہوں لیکن افسوس کہ نہ پڑھ سکتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں۔ بہت طول طویل رفاقتوں کے باوجود بھی وہ میرے لیے اجنبی ہے اور میں اس کے لیے۔ قرب کے اس تسلسل کو شمار کرتا ہوں تو وقت بھر بھری مٹی کی طرح میرے ہاتھوں سے سرکنے لگتا ہے۔ زندگی کی ٹھوس فصیلیں پگھل پگھل شفاف دائروں میں ڈھلتی ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کمرے سے باہر، اردگرد اور اس سے پرے اور اس سے بھی پرے جہاں جہاں نظر پڑتی ہے، میں اور وہ ساتھ ساتھ ہیں۔ میں زقند بھر کر سالوں صدیوں کو پھلانگتا ہوا تاریخ کی دھند میں بہت دور تک اترتا ہوں اور اسے تلاشتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرب کا یہ بندھن اس بھی پہلے، دور بہت دور کہیں، پہلی بار گندھے جانے سے بھی پہلے پڑاؤ در پڑاؤ، سلسلہ در سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ میں اور وہ، وہ اور میں ایک دوسرے میں مدغم، ایک دوسرے میں گم...... لیکن اجنبی...... آہ کھرچ کھرچ کھرچنے سے بھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ میں کون

ہوں، وہ کون اور ہمارے ارے پرے اِدھر اُدھر یہ دائرہ در دائرہ بکھراؤ کیا ہے...... میں سوچوں کے بھنور میں سے جست بھر کر دوبارہ سے بیڈ پر آ بیٹھتا ہوں؛ اونگھتے لمحوں اور بکل میں لپٹے سناٹے کو ایک نظر دیکھتا ہوں اور پھر سے ہیولے کو تکنے میں مگن ہو جاتا ہوں۔

کرم......

کرم اے صاحبِ جُود عطا

کہ ترے کرم کے بغیر میرے وجود کی تختی بے حرف بے صدا ہے

بے بسی......آہ بے بسی

آہ یہ عذابِ بے پناہ

یہ وبالِ بے کنار

نہ زمیں پھٹتی ہے کہ میں اس میں سما جاؤں اور نہ آسماں مہرباں ہوتا ہے کہ مجھے نگل لے۔ دل ابل ابل چشمے کی مانند بہہ نکلا ہے اور آنکھیں سلگ سلگ انگارہ بن گئی ہیں مگر میرا حال مجھ پر کُھلا نہیں۔ چٹیل فصیلیں غضب ناک تند خُو لمحوں میں سے سر ابھارے کھڑی ہیں اور میرے ناتواں ہاتھ ان کے آہنی دروازوں پر دستک دے دے کر شل ہو چکے ہیں۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر فریاد کرتا ہوں، بلک بلک دہائی دیتا ہوں، کاش کوئی مسیحائی کو اترے، کاش کہ کوئی درد بانٹے۔ اک ذرا پل ہی کو سہی۔ اک ذرا پل ہی کو کہیں سے کوئی پچکارے تو میں یہ سمجھوں کو گویا مرادوں سے میرا دامن بھر گیا۔ زیادہ کی طلب نہیں۔ میرے ہونٹوں پر گلاب مہکیں......نہ سہی۔ میری آنکھوں میں ستارے جھلملائیں......نہ سہی۔ میری سانسوں میں ترنم اترے......نہ سہی۔ ایسا کچھ بھی نہ سہی کہ جنم جنم کے ترسے ہوئے کو بس ایک ننھی سی عطا ہی بہت ہے۔ شناسائی کا اک قطرۂ بے مایہ، ترحم کا اک تارۂ کم نور، تفہیم کا اک سایۂ مجہول۔ افسوس، افسوس کہ میں شاید اتنے کا بھی سزاوار نہیں۔

آہ بے بسی...... بے بسی

تشنہ لبی......غریب الوطنی......

اضطراب مسلسل بڑھ رہا ہے، بھیانک چہرے والی بے رحم اداسی بین کرنے لگی ہے اور اندر ہی اندر سینہ پیٹتا کرب بے قابو ہوا جاتا ہے۔ میں وارفتگی کے عالم میں ہیولے کے کچھ اور سمٹ آتا ہوں، ہونٹ ہونٹوں کو چوس لینے اور آنکھیں آنکھوں میں پیوست ہو جانے کو بے قرار ہیں۔ اچانک انجماد ٹوٹتا ہے اور آواز آتی ہے...... پڑھ۔ میں اسے پورے کا پورا اپنے اوپر اوڑھ لیتا ہوں اور ایک ایک لفظ پر انگلی رکھ کر سطر سطر پڑھنے لگتا ہوں۔ ایک دفعہ پڑھ چکنے کے بعد پھر پڑھتا ہوں، بار بار پڑھتا ہوں اور شاید ساتھ ساتھ لکھتا بھی جاتا ہوں لیکن عجب ہے کہ دوہرائے جانے کے باوجود نہ وہ پڑھا جاتا ہے نہ لکھا جاتا ہے۔ انگلی میرے اپنے وجود پر دھری ہے اور میں اپنے آپ کو پھیلائے اور اپنے آپ کو اوڑھے سوچ کے بھنور یلے دائروں میں ہلکورے کھائے چلا جاتا ہوں...... آہ افسوس کہ میں کچھ بھی تو نہیں پڑھ سکتا۔ شاید میں پڑھنا جانتا ہی نہیں۔ میں ہذیانی ہو ہو ہیولے کو اپنے اوپر سے اتارتا ہوں اور اسے بیڈ پر پورے کا پورا پھیلا کر اپنا آپ اسے اوڑھا دیتا ہوں اور بھینچ بھینچ کر کہتا ہوں...... پڑھ۔ وہ ایک دفعہ (سے ی تک مجھے پڑھتا ہے اور لکھتا ہے اور پھر بار بار پڑھتا اور لکھتا ہے لیکن اجنبیت کا کورا کاغذ جوں کا توں ہے۔ کہیں کوئی نقطہ تک بھی نہیں ابھرا۔ ہیولا بے بسی سے میری طرف دیکھتا ہے، اک سرد آہ بھرتا ہے اور آنکھیں میچ لیتا ہے۔

کمرے میں وقت کی ٹک ٹک دوبارہ سے آغاز ہو گئی ہے۔ اونگھتے لمحے ہڑ بڑا کر اٹھے ہیں اور بیدار ہوتے ہی انھوں نے ماحول کی چادر لوتھڑا لوتھڑا کر دی ہے۔ قالین پر اپنی بکل میں سمٹا سناٹا رفتہ رفتہ تحلیل ہو رہا ہے اور ایک بے ہنگم شور مسلسل پھیلے چلا جاتا ہے۔ موسیقی کے سُر اکھڑ رہے ہیں۔ گلاب اور موتیے کے پھول مرجھانے لگے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ برسوں کی بانجھ امیدوں پر خزاں کا عالم جوں کا توں ہے۔ منجمد خواب منظروں میں اندھیرا ناچ رہا ہے اور کہیں سے کسی روشنی کے اتر آنے کا گماں تک بھی نہیں۔

منجمد لمحوں کا سفر

سردی کی شدت بڑھتی چلی جارہی ہے۔ دن بھر سورج روپوش رہتا ہے اور رات کو خنک ہوائیں دھندلے غبار کو ساتھ لیے مسلسل چلتی رہتی ہیں۔ کئی مہینوں سے بارش نہ ہونے کی وجہ سے سبزے پر پیلاہٹ غالب آ گئی ہے۔ درخت ٹنڈ منڈ، باغ باغیچے ٹھٹھرے ہوئے اور ہر ہر چیز سہمی ہوئی سی دکھائی دیتی ہے۔ چند روز پہلے دور پہاڑوں پر برف باری کی خبر آئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہوا میں کاٹ زیادہ ہوگئی ہے۔ کل رات یخ ٹھنڈی تھی لیکن آج تو جب سے اندھیرا پھیلا ہے، خنکی سینہ چیرے چلی جارہی ہے۔ شہر کی سڑکیں اور گلیاں سنسان ہیں۔ سب لوگ جلدی جلدی اپنا کام سمیٹ گھروں کو روانہ ہوگئے ہیں اور اب کچھ دیر سے تو بس ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ گلی گلی ویرانی پھیل رہی ہے۔ گھروں سے چھن چھن کر اترتی روشنیاں اور چوراہوں میں لگے بجلی کے قمقمے گہری چپ کی بکل تلے اونگھ رہے ہیں۔ دھندلا غبار سناٹوں کی گود میں اتر رہا ہے، اندھیروں نے اپنا آپ پھیلا کر گولائیوں میں گھومے منظروں کو ڈھانپ لیا ہے، برفیلی ہوائیں گرماہٹوں کو چاٹتی ہوئیں قریہ قریہ گھوم رہی ہیں اور گمان گزرتا ہے کہ شاید صبح تک سب کچھ جم کے رہ جائے گا۔

بڑی سڑک پر میرے ساتھ ٹہلتے بوڑھے کو بھی یہی گمان ہے۔ وہ بار بار ہاتھ پہ

ہاتھ مارتا ہے اور لفظ لفظ پر زور دے کر کہتا ہے کہ اس کا گمان محض گمان نہیں اٹل حقیقت ہے۔ میں اسے قائل کرنے کی بہت کوشش کر چکا ہوں لیکن وہ مصر ہے کہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں یا شاید اس کے چند دنوں مہینوں بعد وہ کچھ ہونے والا ہے جو پہلے کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ اس کی ناتواں کمر آگے کو جھکی ہوئی ہے، داڑھی اور سر کے بال سفید ہوتے ہوتے برف کا لچھا سا بن گئے ہیں، جھریوں نے بدن کے انگ انگ میں کنڈلی ماری ہوئی ہے اور رعشہ اسے پورے کا پورا جھنجھوڑ رہا ہے...... مسلسل جھنجھوڑ رہا ہے۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے ایک بڑا سا اوورکوٹ پہن رکھا ہے، سر پر گرم اونی ٹوپی ہے اور گلے میں مفلر لپٹا ہوا ہے۔ نہایت آہستگی سے قدم اٹھاتے اٹھاتے وہ رکتا ہے، اپنا چہرہ میرے چہرے کی طرف کرتا ہے اور پوچھتا ہے؛ اے میرے ساتھ ساتھ چلنے والے! کیا تُو جانتا ہے کہ میری عمر کتنی ہے؟؟ میں نفی میں سر ہلاتا ہوں تو وہ مسکراتا ہے اور دیر تک مسکرائے چلا جاتا ہے۔ پھر اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں سے دھند کو ٹٹولتا ہے، انگلی سے فٹ پاتھ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے...... میری عمر، میری عمر اس زمین کی عمر سے بھی بڑی ہے۔ تُو کہتا ہے کہ میرا گمان محض گمان ہے تو سن...... سن کہ میری عمر تیرے سر پر تنے آسمان کی عمر سے بھی بڑی ہے۔ میں...... میں تیرے یقین میں بیٹھے ہر بڑی عمر والے سے بھی بڑا ہوں۔ وہ قہقہہ لگاتا ہے، ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے اور دھیرے دھیرے ٹہلنے لگتا ہے۔ میں چپ چاپ اسے دیکھتا ہوں، اک ذرا توقف کرتا ہوں اور پھر اس کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیتا ہوں۔

چمن چائے پان والے کے پاس پہنچ کر ہم نے حسب معمول چائے پی، انگیٹھی کے قریب بیٹھ کر حقہ گڑگڑایا، ایک ایک میٹھا پان بنوا کر منہ میں دھرا اور واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ فضا میں سوگواریت منڈلا رہی ہے۔ بوڑھا روز ہی کچھ نہ کچھ کہتا رہتا ہے اور یقیناً اس کی اکثر باتیں بڑے پتے کی ہوتی ہیں اور یقیناً وہ ٹھیک بات کرتا

ہے لیکن آج اس نے جو کچھ کہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ سٹھیا گیا ہے۔ ہمیشہ سے یہی ہوا ہے کہ کمرے میں پہنچ کر وہ ٹی وی آن کرتا ہے، کمبل اوڑھ کر دیوار سے ٹیک لگا لیتا ہے، خبریں سنتا ہے اور گھنٹے آدھ گھنٹے بعد قہوے اور سگریٹ کی فرمائش کرتا ہے۔ آج اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ آتے ہی اس نے وضو کیا، کپڑے بدلے، مصلاّ بچھایا اور اب وہ سجدے میں گرا گڑگڑا رہا ہے...... مسلسل گڑگڑا رہا ہے۔ شاید بڑھاپے کے خوف نے اسے لرزا کے رکھ دیا ہے یا شاید سردی کی شدت نے اس کے دماغ کو سُن کر دیا ہے۔ یا شاید یہ سارے کا سارا ناٹک مجھے قائل کرنے اور اپنے کہے کو منوانے کے لیے ہے۔ میں اسے ایک نظر دیکھتا ہوں، اپنے لیے قہوہ بناتا ہوں اور کمبل اوڑھ کر دیوار سے ٹیک لگا لیتا ہوں۔

کمرے کا دروازہ آپ ہی آپ کھلتا اور بند ہو جاتا ہے۔ میرا جسم تحلیل ہو کر باہر پھیلی دھند میں گم ہو رہا ہے؛ اندھیروں کے اندر ہی اندر سرکتا ہوا، ہواؤں کے تہ در تہ پھیلے غلافوں کو چیرتا ہوا...... بہت دیر بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے گرداگرد شفافیت ہی شفافیت ہے۔ یہاں سے میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں اور سن سکتا ہوں اور محسوس کر سکتا ہوں...... وہ بھی کہ جو ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے اور وہ بھی کہ جو ہو چکا ہے۔ ایک گہری چپ سارے کے سارے منظر میں پھیلی ہوئی ہے اور لامتناہی وسعتوں میں جہاں جہاں تک نظر پڑتی ہے اَن گنت لاتعداد نقطے سے رواں دواں ہیں۔ بسیط فضاؤں میں تیر رہے ہیں، گھوم رہے ہیں، ٹمٹما رہے ہیں۔ بہاؤ پُرسکون، حرکت لطیف تر، کوئی ٹکراؤ نہ رکاوٹ، ردھم ہی ردھم، ٹھیک ٹھیک طے کی ہوئی رفتار اور فاصلے اور قربتیں۔ میں اپنے آپ کو سمیٹ سمیٹ ان کے بیچوں بیچ تیرتا ہوں اور بہت دیر تک تیرتا رہتا ہوں۔ دفعتاً گمان گزرتا ہے کہ شاید میں اس بہاؤ میں رکاوٹ بن رہا ہوں اور اگر کچھ دیر مزید یہاں ٹھہرے رہنے کی کوشش کی تو سب کے سب نقطے آپس میں ٹکرا جائیں گے۔ میرا وجود...... آہ میرا وجود اک

کھردرا کٹیلا پتھر، اک کھنکھنا تا ٹھیکر، اک جما ہوا خون لوتھڑا! اس سارے منظر میں کہیں بھی تو موزوں ہوتا نظر نہیں آتا۔ اچانک ایک طرف سے بوڑھا نمودار ہوتا ہے، میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا دائرہ در دائرہ اترتا ہے اور پھر اترتا ہی چلا جاتا ہے۔ کمرے کا دروازہ آپ ہی آپ کھلتا اور بند ہو جاتا ہے۔

سامنے کی دیوار پر ایک تصویر ابھرتی اور گم ہو جاتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے تصویر کے ابھرنے اور گم ہونے کی تکرار ہوتی ہے۔ میں اپنے بستر پر کمبل اوڑھے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ تصویریں مسلسل ابھرتی اور گم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک کے بعد ایک تصویر کہ جو منجمد ہے اور یقیناً منجمد ہے لیکن بہاؤ کی تیزی نے اسے متحرک کر دیا ہے۔ ہر تصویر پر خون کے چھینٹے ہیں اور آگ اور دھواں اور دھند ہے۔ ادھڑے ہوئے لوتھڑے، سڑی ہوئی ہڈیاں اور گچھا در گچھا انتڑیوں کے ڈھیر۔ سخت وحشت میں مبتلا کر دینے والے مناظر اور مسخ شدہ ماحول۔ تصویریں کمرے کی دیوار پر اوپر سے نیچے کو رواں دواں ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گاڑھے سیاہ خون کا کوئی چشمہ دور اونچائیوں پر ابل پڑا ہے اور پوری تندی سے اترائیوں کو لڑھکتا ایک آبشار کی طرح چیختا شور مچاتا میرے کمرے میں گر رہا ہے۔ بوڑھا تھوڑی دیر کے لیے سجدے سے سر اٹھاتا ہے، اپنی انگلی دیوار کی طرف کر کے کچھ پھونکتا ہے اور دوبارہ سجدے میں گر جاتا ہے۔ میری آنکھیں آپ ہی آپ مندھ جاتی ہیں اور جب دوبارہ کھلتی ہیں تو دیوار پر سے خون کا بہتا آبشار غائب ہو چکا ہوتا ہے۔

دور کہیں سے ایک سرگوشی سی اتر رہی ہے اور مسلسل اتر رہی ہے۔ اک گنگناہٹ کہ جس کو میں نہ چاہتے ہوئے بھی بہت غور سے سنتا ہوں۔ کہنے والا نہ جانے کون ہے اور نہیں معلوم کہ سننے والا فقط میں ہی ہوں یا کوئی اور بھی لیکن آواز گونج رہی ہے اور میں گمان کرتا ہوں کہ کمرے کی دیواروں کا اُس پار بھی یہ ارتعاش ایسا ہی شفاف اور واضح ہوگا۔ کہنے والا

کہتا ہے کہ ہر گزرتا لمحہ پہلے والے لمحے سے بدتر ہے۔ آج کا دن گزرے ہوئے کل سے، کل پرسوں سے اور پرسوں ترسوں سے بدتر۔ وقت کا بھنور یلا دائرہ اب تیزی سے پستی کی طرف لڑھکنے لگا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ اس کے گہری کھائی میں گرتے ہی سب کچھ بھک سے اڑ جائے۔ جان لو اور خوب خوب جان لو کہ یقیناً بہت جلد یہ بھونچال آغاز ہونے کو ہے اور یقیناً ایسا ہو کے رہے گا۔ میں متوحش ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہوں، کمبل کو اپنے اوپر سے نوچ ایک طرف کو پھینکتا ہوں اور جست لگا کر دروازے سے باہر نکل آتا ہوں۔ سردی کی ایک تیز لہر میرے وجود کے آر پار ہو جاتی ہے لیکن میں نہیں رکتا۔ ٹھٹھری ہوئی رات میں سنسان گلیوں اور سڑکوں اور بازاروں کے بیچوں بیچ گزرتا ہوں اور ایک طول طویل چکر کاٹتا زمین کی گولائیوں میں موڑ موڑ مڑی زندگی کو ٹٹولتا مسلسل گھومے چلا جاتا ہوں۔ قدم قدم ٹھہرتا ہوں اور دروازہ در دروازہ جاگنے والوں اور سونے والوں کو آوازے دیتا ہوں، چیخ چیخ کر پکارتا ہوں اور انھیں آواز کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن سب لوگ گویا کہ برف کی سِلیں ہیں۔ سپاٹ چہروں سے مجھے دیکھتے ہیں اور اپنے آپ میں مگن ہو جاتے ہیں۔ پتھرائے ہوئے تختے گھوم پھر رہے ہیں، ناچ گا رہے ہیں، کھا پی رہے ہیں، سو جاگ رہے ہیں۔ ہر گزرتا لمحہ پہلے والے لمحے سے بدتر ہوا جاتا ہے اور افسوس کہ انھیں اس بات کا گماں تک بھی نہیں۔ میں کمرے کی طرف مڑتا ہوں اور ارادہ کرتا ہوں کہ بوڑھے کو یہ روداد کہہ سناؤں گا اور یقیناً وہ یہ سب کچھ جانتا ہی ہے۔ پہلے کی طرح اب بھی وہ قہقہہ لگائے گا، ہاتھ پہ ہاتھ مارے گا اور لفظ لفظ پر زور دے کر کہے گا کہ میرا گمان محض گمان نہیں اٹل حقیقت ہے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں یا شاید اس کے چند دنوں مہینوں بعد وہ کچھ ہونے والا ہے کہ جو پہلے کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا۔

بڑی سڑک پر سے اتر کر کمرے کی طرف سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں گہری گھنی رات پر دھیان کرتا ہوں، ٹھٹھرے ہوئے منظروں اور منجمد ماحول کو ٹٹولتا ہوں اور ایک

پژمردہ چال چلتا کمرے میں داخل ہو جاتا ہوں۔ بوڑھا بدستور سجدے میں گرا ہوا ہے۔ میں اسے پکارتا ہوں اور بار بار پکارتا ہوں لیکن کوئی جواب نہیں ابھرتا۔ ایک عجب اضطراب سا در و دیوار سے رِسنے لگا ہے۔ یخ ٹھنڈے غبار کا کوئی گولا سا میرے اندر ہی اندر پھٹتا ہے اور تیزی سے پھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ گھٹن بڑھ رہی ہے، مسلسل بڑھ رہی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید چند لمحوں بعد سب کچھ پتھرا کے رہ جائے گا۔ نڈھال ہو کر گرنے سے پہلے میں ایک بار پھر بوڑھے کو پکارتا ہوں اور قریب ہو کر اسے جھنجھوڑتا ہوں تو وہ کھوکھلے تنے کی مانند ایک طرف کو لڑھک جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں، چہرہ سپاٹ ہے اور جسم برف کی سِل...... ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسے مرے ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں۔

گم شدگی عنواں

رات آدھی بیت چکی...... آدھی باقی ہے

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا ہے اور امید ہے کہ جلد یہ سفر اپنے اختتام کو جا پہنچے گا۔

لیکن یہ حتمی بات نہیں۔

ہوسکتا ہے اگلے ہی لمحے تار ٹوٹ جائے اور میں نہ آگے جاسکوں نہ پیچھے۔

میرے دائیں طرف جو لوگ تھے ان میں سے اکثر کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ اور بائیں طرف والوں کے ساتھ بھی۔ آگے اور پیچھے والوں کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔

شاید آگے اور پیچھے کوئی تھا ہی نہیں۔

یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ آگے والے شاید بہت ہی آگے نکل چکے ہیں اور پیچھے والے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ معلوم نہیں ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ مڑ کے دیکھتا ہوں تو انت سناٹوں اور گھپ اندھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ جی چاہتا ہے کہ قدم قدم پیچھے کو سرکنا شروع کر دوں اور سرکتے سرکتے ان سے جا ملوں یا جہاں کھڑا ہوں وہیں جم کے کھڑا رہوں تاوقتیکہ وہ مجھ سے آملیں لیکن جانتا ہوں کہ ان میں سے کوئی صورت بھی ممکن نہیں۔ ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ میں دیوانہ وار آگے کو بھاگنے لگوں اور بھاگتے بھاگتے بہت آگے نکل جانے والوں کو جا پکڑوں یا کوئی سبیل ایسی نکلے کہ وہ آپ ہی آپ ٹھہر جائیں اور

میرے آملنے کا انتظار کریں۔ یہ صورت بھی ممکن نہیں۔ یقیناً ایسا کچھ بھی نہیں ہوسکتا اور اگر ہو بھی جائے تو کیا حاصل کہ نہ وہ مجھے پہچان پائیں گے اور نہ میں انھیں۔ صدیوں پھیلی دھند اور فاصلوں کا غبار ہمیں اپنے حصار میں پوری طرح جکڑے ہوئے ہے اور خوب خوب کوشش کے باوجود بھی ہم اس سے باہر نہیں نکل پاتے۔ میری پہچان...... میری پہچان تو میرے دائیں بائیں والوں سے وابستہ ہے۔ ان کے ساتھ ہوں تو میں ہوں، نہیں ہوں تو نہیں ہوں۔

میں دیدے پھاڑ پھاڑ اپنے دائیں بائیں دیکھتا ہوں اور جاننے اور محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

رات آدھی بیت چکی...... آدھی باقی ہے۔

وہ سب اپنے کپڑے اتار ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے ہیں۔ ننگے جسموں پر اُگا کوڑھ صاف دکھائی دیتا ہے۔ کھوکھلے پنجر اپنے آپ کو سہارنے کی تگ و دو میں مگن ہیں۔ خارش زدہ پچکے خواب سجائے وہ کبھی دیوانہ وار کبھی دھیرے دھیرے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں اور آر پار ہو جاتے ہیں۔ ٹکراتے وقت عجب وحشت ناک چیخیں ابھرتی ہیں، لوتھڑے اڑتے ہیں، خون فواروں کی طرح ابلتا ہے، شعلے سے اٹھتے ہیں اور ایک سخت بدبو سی چاروں اور پھیل جاتی ہے۔ مسخ شدہ بھیانک چہرے، خون آلود آنکھیں، کٹے پھٹے ہونٹ اور چھلنی چھلنی جسم...... ماحول سارے کا سارا نہایت خوفناک ہو چکا ہے۔ آسمان سے خون برستا ہے اور آگ اور دھواں۔ زمین پر سبزہ نام کو نہیں، پتھر تک جل کر کوئلہ ہو گئے ہیں۔ پانی خشک ہوا اور اب اس کی جگہ پیپ ابلتی ہے۔ ہوا سخت بدبودار اور تند ہو چکی ہے۔ جھکڑ سے ہمہ وقت گردش میں ہیں اور ہر سانس پر ایسا لگتا ہے کہ گویا پھیپھڑے اچھل کر باہر آ پڑیں گے۔

دائیں طرف بھی یہی کچھ ہے اور بائیں طرف بھی۔

لیکن یہ میرا واہم بھی ہو سکتا ہے۔

خیال آتا ہے کہ شاید میری آنکھیں بند ہیں اور میں منظر کی بجائے اس کا عکس دیکھ رہا ہوں۔ عکس در عکس کہ جو بند آنکھوں کے اس پار کچھ اس طرح سے گڈ مڈ ہیں کہ یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا...... یہاں کوئی دایاں بایاں اور آگا پیچھا بھی نہیں۔

میں اپنے آپ کو کوستا ہوں اور دوبارہ سے دیدے پھاڑ پھاڑ ارد گرد ٹٹو لنے لگتا ہوں اور خوب خوب ٹٹولتا ہوں۔

اندھیرے میں سے ایک منظر نکلتا ہے، اس کے بعد ایک اور......اور ایک اور

مناظر پھیلاؤ کھینچتے اور مسلسل قریب آتے اور دور جاتے ہیں۔

دھواں اور دھند اور اندھیرا

خون کی چادر جوں کی توں ہے۔

سخت وحشت میں مبتلا کر دینے والا ماحول اور پل بہ پل تلخ تر ہوتی صورتیں۔ یقیناً پہلے بھی جو کچھ میں نے دیکھا کھلی آنکھوں ہی دیکھا اور کچھ شک نہیں کہ اب بھی میری آنکھیں کھلی ہیں۔ تو گویا یہ عین مین حقیقت ہے......

نہیں نہیں !! جھوٹ......

بالکل جھوٹ

کچھ گڈ مڈ ہو رہا ہے۔

اگر میں یہ مان لوں کہ یہ عین مین حقیقت ہے تو مجھے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ میں بھی اس حقیقت کا حصہ ہوں۔

ایک مسخ شدہ لوتھڑا

کھوکھلی ہڈیوں کا پنجر

نہایت کریہہ صورت اور خوفناک

میں وحشت زدہ ہو کر اپنے آپ کو ٹٹولتا ہوں اور جز جز سمٹنے لگتا ہوں۔ ہاتھ خود بخود سارے جسم پر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر سرکتے ہیں اور آپ ہی آپ یہ عمل کئی بار دوہرایا جاتا ہے۔ سر!...... ہاں سر سلامت ہے۔ اور دستار!...... دستار بھی۔ آنکھیں، کان، منہ اور ہاتھ اور پاؤں...... سب سلامت ہیں۔ ہر ہر جز کو میں پکارتا ہوں اور نام لے لے کر اس کی زندگی کے بارے میں دریافت کرتا ہوں۔ جواب اثبات میں آتا ہے اور کبھی نفی میں۔ اور کبھی نفی اور اثبات دونوں گم ہو جاتے ہیں۔ بے اختیار دل کی طرف دھیان جاتا ہے اور میں اس کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں فکر مند ہوتا ہوں۔ اسے تو سب سے پہلے دیکھا جانا ضروری تھا۔ میں تیزی سے اس کے گوشے گوشے میں اترتا ہوں اور اترتا ہی چلا جاتا ہوں...... وہ سلامت ہے اور صد شکر کہ وہ سلامت ہے۔

تمنا...... آہ تمنا

یہ سب محض ایک تمنا سے زیادہ کچھ نہیں۔ میری پہچان میرے دائیں بائیں والوں سے وابستہ ہے اور میں کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہوں کہ وہ سب کے سب اک عذاب کے عالم میں ہیں۔ تو ایسے میرا سلامت رہ جانا محض ایک تمنا اور خواب ہی ہو سکتا ہے۔ شاید سب اپنے اپنے طور پر یہی گمان کر رہے ہیں اور خواب دیکھ رہے ہیں اور یقیناً خواب اور حقیقت میں دوریوں کے انت سمندر ہیں۔ لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے ہم میں سے کوئی بھی سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ نہ ناظر، نہ منظر، نہ نظارہ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے سمیت سب کچھ موجود تو ہو لیکن رسائی اور ادراک سے اتنا دور کہ باوجود کوشش کے بھی اس تک پہنچا نہ جا سکے، دیکھا اور سمجھا نہ جا سکے۔ شاید بہت آگے نکل جانے والوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ اور بہت پیچھے رہ جانے والے بھی یہ سب بھگتیں گے۔

میں ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھتا ہوں اور پھر اپنے آپ کو ٹٹولتا ہوں اور سوچتا ہوں آگے اور پیچھے والوں کے بارے میں۔

ہونے اور نہ ہونے کے درمیان جگہ جگہ دراڑیں اور کھائیاں اور گہرے کھڈ ہیں۔ان کے اندر گہری دھند جمع ہو چکی ہے۔ نیچے بہت نیچے گندے سیال پانی کے ذخیرے ہیں۔اور ان میں بڑے بڑے اژدھے اور مگرمچھ۔گرنے والے کبھی ابھر نہیں پاتے۔

تو میں کدھر کو سمٹوں!!

پاؤں تلے ٹھیکر کھنکھنا رہا ہے اور اوپر......اوپر پتہ نہیں کیا ہے۔

میری پہچان میرے دائیں بائیں والوں سے وابستہ ہے......

ان کے ساتھ ہوں تو میں ہوں، نہیں ہوں تو نہیں ہوں۔

غلط، بالکل غلط

یہاں تو کچھ ہے ہی نہیں۔اور اگر ہے بھی تو مجھے اس کو دیکھنے کی تاب نہیں۔یا شاید میں دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔دیکھوں بھی تو آگے اندھیرا ہے۔اور اندھیروں میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

رات ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف سفر کر رہی ہے۔

میرے اضطراب سے بے نیاز

سرک رہی ہے، مسلسل سرک رہی ہے۔

آدھی بیت چکی......آگے کی خبر نہیں۔

گھنی سیاہ رات

اتنا سناٹا کہ سوئی بھی گرے تو کھنکھناہٹیں گونج اٹھیں

اتنا اندھیرا کہ اپنے ہونے کے احساس پر بھی کالک پھر جائے

سوچ کی بھربھری دیواروں پر ٹھاٹھیں مارتا دریائے خوناب

انا کی بکل میں لپٹے وجود پر پھیلتا تعفن

کھنڈر آنکھوں میں کھدی ویرانی

اور سلے ہوئے ہونٹوں پر منجمد' کائی زدہ چپ

کاش کہیں سے پتھر ہی برستے: زہر بجھے کنکروں کی باڑ؛ یا کوئی چنگھاڑ؛ یا بے رحم تند گھماؤ والا طوفان۔ کاش کہیں سے کچھ تو ایسا ہوتا کہ مہیب ٹھہراؤ کے تنے ہوئے سینے میں سینکڑوں دراڑیں آ پڑتیں۔ کوئی تیز سنسناہٹ سب کچھ چھیدتی ہوئی گزر جاتی اور روند ڈالنے والی ہوائیں ہر ہر نقش کو یوں بہالے جاتیں کہ جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

عجب وقت آپڑا ہے

ایسا عجب کہ نام بے نام ہو گئے

صدائیں صداؤں پر چسپاں ہیں

چہرے چہروں پر

وجود وجودوں پر

ہر ایک دوسرے پر چسپاں ہے۔ دوسرا تیسرے پر اور تیسرا......

تیسرے کو کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا

گھنے سیاہ بالوں والی ڈائن اداسی ایک طرف بیٹھی مکالمہ لکھ رہی ہے۔ اپریل دو ہزار سات کے بُور لدے موسموں کی ایک رات۔ گھور اندھیری رات۔ خنکی قطرہ قطرہ اندھیروں کی گود میں اتر رہی ہے۔ اٹھلاتی ہوائیں درختوں پر کندہ خشک خزانوں کو پتی پتی نوچتی چلی جا رہی ہیں۔ ننھی منی گداز کونپلیں کلکاریاں بھرتی، مسلسل اگی چلی آتی ہیں۔ گلی گلی رقص کرتی خوشبوئیں؛ نئے موسموں کی خوشی مناتے ڈال ڈال پھدکتے پرندے؛ جذب کی شوخی میں ڈوبے ہوئے رنگ اور جنگل جنگل، صحرا صحرا، دریا دریا پھیلتا حسن دیوی کا نرمیلا تبسم۔ جنتیں اپنا آپ سمیٹ زمین پر اتر رہی ہیں مگر وہ سب...... وہ سب ایک دوسرے پر خود کو چسپاں کر کے گہری نیند سو گئے ہیں۔ گھنے سیاہ بالوں والی ڈائن اداسی ایک طرف بیٹھی مکالمہ لکھ رہی ہے۔

کہانی تھوڑی دیر کے لیے آغاز ہوتی اور گم ہو جاتی ہے۔ کہیں سے ایک متلاہٹ زدہ مُلّا ہڑبڑا کر اٹھتا ہے؛ اپنی دھندلائی آنکھوں سے ستاروں کو ایک نظر ٹٹولتا اور پھر دمے ماری آواز میں اذان۔ چھابڑیوں والے سبزی منڈی کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ کچرا اکٹھا کرنے والے جھاڑو اٹھا ایک سڑک سے دوسری تک پھرتے اور سو جاتے ہیں۔ رات بھر کروٹیں بدلنے والوں کے خمار میں ذرا دیر کو ملگجی روشنیوں کا ایک تار سا جھلملاتا ہے؛ غسلخانوں میں مثانے خالی کرنے کی آوازیں؛ بلغمی کھنکاریں اور پھر مکمل چپ۔

گھنے سیاہ بالوں والی ڈائن اداسی، انگڑائی لے کر اٹھتی اور دھیرے دھیرے ٹہلنے لگتی ہے۔ زمین اس کی ہتھیلی پر ربڑ کی ایک ننھی منی گیند کی طرح آ بیٹھتی ہے اور وہ دور اونچائیوں پر ٹکے اپنے سر میں پیوست آنکھوں سے گیند کی گولائیوں کو تکے چلے جاتی ہے......بس تکے

چلے جاتی ہے۔نہیں معلوم اس کا دوسرا ہاتھ کہاں ہے؛ دھڑ کہاں اور وہ کھڑی ہے یا بیٹھی؛ رکی ہے یا چل رہی ہے۔ زمین اس کی ہتھیلی پر لڑھک رہی ہے۔ دمشق...... دمشق سے کوفہ؛ کوفہ سے اندلس؛ بغداد؛ دلی؛ قسطنطنیہ؛ لاہور...... بُورلدے موسموں میں گلی گلی قریہ قریہ گہری نیند میں مگن ہے۔خمار کا مخملیں جُھولا جھل رہا ہے اور سب ایک دوسرے پر خود کو چسپاں کر کے گہری نیند سو گئے ہیں۔ڈائن اداسی آہستگی کے ساتھ گیند کو اپنی ہتھیلی پر سے سرکا دیتی ہے اور خود سمٹ کر وہیں آ بیٹھتی ہے جہاں پہلے بیٹھی مکالمہ لکھ رہی تھی۔

کہانی تھوڑی دیر کے لیے پھر آغاز ہوتی ہے۔اب کے کوئی کتا بھونکتا ہوا نیندوں کو درہم برہم کرتا گزر جاتا ہے۔انگڑائیاں لیتے جسم پتلونیں سنبھالتے لائنوں میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ملگجی روشنیوں میں ایک تیز آواز...... دائیں سے...... سیدھاااا چل۔ بائیں سے...... الٹاااامڑ۔ چیک ون ٹُو؛ چیک ون ٹُو...... دھم دھم دھم۔ دھم دھم دھم۔تُو گدھا ہے! یس سر...... تیز آواز پھر گونجتی ہے...... تیرا باپ بھی گدھا ہے۔یس سر۔تُو نسل درنسل گدھا ہے...... یس سر۔ چیک ون ٹُو۔ دھم دھم دھم۔تالیاں بجتی ہیں اور میدان خالی ہو جاتا ہے۔ان میں سے باغ میں گوڈی کرنے والے کھرپا درانتی سنبھالے ادھر کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ درختوں کے تنوں پر' پتھروں پر' رستے کی روشوں پر چونا پھیرنے والے چونے والا ڈبا اور برش اٹھا اپنی راہ لیتے ہیں۔ لانگری لنگر پکاتے ہیں اور پھر سب پیٹ بھر بھر اپنی انتڑیوں کو گرماتے' ڈکاریں مارتے' بستروں میں گھس جاتے ہیں۔اوّل اوّل اونگھ غالب آتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے نیند کی چادر سب کچھ سمیٹ لیتی ہے۔گھپ اندھیرا جوں کا توں ہے۔

کون کس کی آنکھوں میں خواب بُنے !!

نائیلو اوجھڑیوں میں

سڑے سیال مادے کی تند لہروں پر

غرورِ عز و ناز کے محل
خارش زدہ بیزار چہروں کی
اک آخری تمنا ہیں
کوئی نوحہ نہ ترنگ و خروش
کوئی ماتم نہ امید راگ و رنگ
پیپ رِستے جسموں پر
مکھیاں بھنبھناتی ہیں
مکھیاں بھنبھنائیں گی۔ گدھ نوچ کھائیں گے۔

گھنے سیاہ بالوں والی ڈائن اداسی نے بیزاری سے پہلو بدلا۔ کچھ دیر ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ ٹکائے سامنے پڑی ڈائری کو گھورتی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالیا اور ورق ورق الٹنے لگی۔ سامنے والی گلی میں شاید کسی دھت پڑے شرابی کی آنکھ کھلی ہے۔ اس نے کپڑے جھاڑے اور منہ سے بہتی رال پونچھتا ایک طرف کو ہولیا۔ بیچ چوراہے میں پہنچ کر اس نے ہنکارا بھرا اور پھر ایک لمبی چوڑی تقریر قومیت، خود انحصاری اور ترقی پر اگالتا چلا گیا۔ سنسان گلیوں میں سے کچھ ہونق زدہ ہیولے نمودار ہونے لگے اور پھر رفتہ رفتہ ایک مجمع سا لگ گیا۔ دیر تک اس کی تقریر جاری رہی۔ جیسے ہی وہ چپ ہوا سب آگے بڑھے اور اسے اپنے کندھوں پر اٹھا نعرے لگاتے گلیوں میں گم ہو گئے۔ آوازیں آہستہ آہستہ دور بہت دور ہوتی چلی گئیں اور آخر آخر فقط ایک ارتعاش سا باقی بچ رہا۔ ڈائن نے ایک نظر چوراہے کو دیکھا، گلیوں میں جھانک جھانک مسلسل پھیلتے سناٹوں کو سونگھا اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھ، ڈائری کا ورق ورق الٹنے لگی۔

پہلے صفحے پر اگست کے مہینے کی کوئی تاریخ کندہ ہے۔ سن کو دیمک نے چاٹ لیا

ہے۔

نیچے بہت سے اشعار لکھے ہیں

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ: ستاروں سے آگے جہاں اور بھی......آگے دیمک

دوسرا شعر؛ تیسرا؛ چوتھا؛ پانچواں شعر

نمبر موجود ہیں مگر شعر غائب۔ ورق ورق تر و تازہ مگر عبارت......

عبارت کا نقطہ نقطہ دیمک نے اچک لیا ہے۔

بہت صفحوں بعد کچھ تقریریں آغاز ہو رہی ہیں:

''اے میرے ہم وطنو!

سنو!''......متن غائب۔ صفحوں کے صفحے کرم خوردہ

ڈائن نے ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور دیر تک ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ کا تکیہ بنائے دور خلاؤں میں گھور گھور دیکھتی رہی۔ آسمان پر بادل اڈنے لگے۔ ستاروں کے جال میں رخنے ڈالتے' ہوا کے کندھوں پر سوار بادلوں نے اندھیروں کو مزید گہرا کر دیا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی ہے۔ گلی گلی ٹمٹماتی روشنیاں اپنا سر بغل میں دبائے چور نظروں سے ادھر ادھر جھانک رہی ہیں۔ چاند گم ہے۔ ستارے گم۔ آسمان گم۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور وہ سب ایک دوسرے پر خود کو چسپاں کیے گہری نیند سو رہے ہیں۔

بارش کا زور مسلسل بڑھ رہا ہے۔ ایک طرف گلی میں کچھ سرسراہٹ سی ہوئی۔ بند کواڑوں کے کھلنے کی آوازیں۔ کوئی بڑبڑاتا ہوا چوراہے کی طرف چلا آ رہا ہے۔ قریب پہنچ کر اس نے بارش میں بھیگتی ڈائری اٹھائی۔ ایک دوکان کے چھجے تلے ملگجی روشنیوں میں صفحوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر ایک خالی صفحے پر قلم گھسیٹنے لگا:

''اپریل دو ہزار سات کی کوئی تاریخ

وقت:......

میں، روز نامچہ نگار سرکارِ عالی، بقلم خود
حالات پُرامن ہیں اور تمام معاملات حسب سابق
مزید تفصیل صفحہ نمبر ایک محررہ ماہِ اگست پر......''

سرکارِ عالی کی ماں کی...... اس نے کسی کو کوسا۔ ڈائری بند کر کے چورا ہے میں اچھال دی اور تیز قدموں چلتا گلی میں گم ہو گیا۔ کواڑ بند ہونے کی آوازیں۔ سیڑھیاں چڑھتی کھٹ کھٹ اور پھر مکمل چپ۔ بارش سے گلیاں جل تھل ہو رہی ہیں۔ ستارے گم ہیں۔ آسمان گم۔ گھنے سیاہ بالوں والی ڈائن اداسی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ ٹکائے چھجے تلے بیٹھی ہے۔ آنکھیں دور خلاؤں میں تیر رہی ہیں اور بن لفظوں کے لکھا مکالمہ اس کے قریب پڑا بارش میں بھیگ رہا ہے۔

چلمنوں کے اس پار

خیال کے دھاروں پر اچھلتے کودتے مناظر لمحہ بہ لمحہ رواں دواں ہیں، سنہری چمکدار مچھلیوں کی طرح کہ جو آن کی آن میں سطح آب پر اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں اور پھر پلک جھپکتے کہیں اور سے جا سر نکالتی ہیں۔ سوچ کے زاویے آپس میں یوں تڑ مڑ سے گئے ہیں کہ گویا کسی دیوانے کی لٹیں ہیں جنہیں آوارگی نے کبھی نہ سنورنے کے لیے الجھا دیا ہے۔ میں سب کچھ سنتا ہوں مگر لفظ کانوں میں گھس کر اندر ہی اندر کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ بس اک شور ہے...... بے ہنگم شور کہ جو ہر دم ذہن کے پردوں سے ٹیک لگائے بیٹھا بین کرتا رہتا ہے...... چیختا چنگھاڑتا رہتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں، ایک ایک نقش کو آنکھوں میں جذب کرتا ہوں، مگر اندھیرا ہے۔ کوئی بھی تو نقش ایسا نہیں جو روشنی بن کر جھلملائے، کچھ دیر کو حلقۂ چشم میں جگمگائے تو اطمینان ہو کہ یقیناً میں دیکھتا ہوں، مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ روشنی ہے، نور ہے، رنگا رنگی ہے، خوبصورتی ہے...... ہوگا...... شاید ایسا ہی ہوگا لیکن میرے ہاں تو سب اندھیرا ہے...... سب اندھیرا۔ غم کی فصیلوں کے اس طرف سب اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

جب میں لفظ لفظ بولنا سیکھا تھا تو ہر طرف لفظ ہی لفظ تھے، لفظوں کے مفہوم بھی تھے اور سنائی بھی خوب دیتا تھا۔ لفظ یاد بھی رہتے تھے اور مفہوم بھی سمجھ میں آ جاتا تھا۔ نہ نہ کرتے

بھی بہت کچھ معلوم ہوتا چلا گیا۔ بولنے والے بھی کیا عجب تھے...... کیا ہی عجب، اس وقت انھیں دیکھا جانا بھی ممکن تھا۔ آنکھوں کے حلقوں میں اتر کر جگمگانا انھیں خوب آتا تھا۔ اسی لیے تو جو کچھ وہ کہتے جاتے میں سنتا جاتا...... سنتا جاتا اور سمجھتا جاتا...... سمجھتا جاتا اور تالیاں بجاتا جاتا۔ وہ کہتے مانو بلی بنو تو میں فوراً اپنی پلکیں میچ کے مانو بلی بن جاتا۔ وہ کہتے خرگوش بنو تو میں کانوں کے ساتھ دونوں ہاتھ بلند کر کے ہلانے لگتا اور خرگوش بن جاتا۔ وہ مجھے گدگدی کرتے تو میں ہنستا، خوب ہنستا اور لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ وہ پپی پپی کہتے اپنا منہ قریب کرتے تو میں بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتا اور وہ بھی مجھے چوم چوم لیتے۔ عجب دن تھے کہ ہر ہر چیز واضح تھی۔ روشنیوں والے روشنیاں بکھیرتے تھے اور میں دیکھتا تھا۔ خوبصورت چلمنوں کے اس پار نور ہی نور تھا۔

قدم قدم چلتے جب اوروں کو دوڑتے بھاگتے دیکھا تو میں بھی بھاگنے لگا۔ خوبصورت رنگ برنگی تتلیوں کے پیچھے...... اجلی اجلی صبحوں میں اٹھکھیلیاں کرتی خوشبوؤں کے پیچھے اور دن بھر چوں چوں کرتی خاکستری چڑیوں کے پیچھے۔ بھاگتے بھاگتے تھک جاتا تو کسی کی پیار بھری گود میں میٹھی نیند کے مزے ساری تھکن اتار دیتے۔ ننھی منی شرارتوں پر کوئی ہولے سے چپت لگاتا تو جھوٹ موٹ کا رو کر اور ذرا دیر منہ بسور کر اس سے لپٹ جانا، اس کی بانہوں میں جُھول جُھول کر منا لینا...... پھر بوسہ دے کر تنگ کرنا اور بھاگ جانا۔ میں بولتا تھا تو سب سنتے تھے اور وہ بولتے تھے تو میں سنتا تھا۔ روز صبح سویرے کسی کی میٹھی آواز جیسے ہی میرے کانوں سے ٹکراتی تھی تو میں اٹھ جاتا۔ مسجد میں پہنچتا تو بولنے والے کی نورانی باتیں سب کی سب سمجھ میں آجاتیں، سکول میں کہنے والے جو کہتے میں سمجھ جاتا اور وہی کچھ کرتا جو وہ حکم دیتے۔ میں کسی کو پکارتا تو وہ جواب دیتا، کوئی مجھے پکارتا تو میں جواب دیتا۔ سب کچھ نظر میں تھا۔ کتنے ہی چہرے تھے جو حلقۂ چشم میں مسلسل جگمگاتے رہتے تھے اور میں جس کو جب چاہتا دیکھ لیتا...... دیکھ لیتا اور خوش ہوتا۔ مسرت اور شادمانی کے ان وقتوں میں ہر

طرف روشنی ہی روشنی تھی۔

وقت کا پنچھی ان حدوں سے باہر نکلا تو رفتہ رفتہ روشنیاں تھرتھرانے لگیں۔ کسی کی گود سے نکل کر تنہا سونے جاگنے کے مرحلے طے ہوتے چلے گئے۔ رسیلے خوابوں کی سوندھی سوندھی خوشبو نے اندھیروں سے اپنائیت کی رہ ہموار کر دی۔ آنکھوں میں برسوں سے روشنی بن کر چمکنے والوں سے وحشت سی ہونے لگی۔ سدا سے کانوں میں رس گھولتی مانوس آوازیں مدھم سے مدھم تر ہوتی چلی گئیں اور خیال کی وادی میں جے خود رو سبزہ زار میں سانپ پھنکارنے لگے۔ رات کے سائے گہرے ہوتے تو یہ سانپ پھن پھیلائے ایک دوسرے پر پل پڑتے...... ساری رات یونہی گزر جاتی مگر سانپ تھے کہ نہ خود سوتے نہ سونے دیتے۔ دن چڑھتا تو اندر ہی اندر ایک دربار سا سج جاتا، ہر چیز آراستہ و پیراستہ، خوبصورت، مدہوش کر دینے والا سماں، جام چھلکاتی خادمائیں، خم لنڈھاتے پری چہرہ غلام، باوفا خوش سلوک درباری...... جن کے درمیان مرصع تخت پر میں جلوہ افروز ہوتا۔ دن رات بس یہی الٹ پھیر تھا کہ نظر میں تھا۔ کہنے والے کہتے کہ تو سنتا نہیں۔ ہم تجھے بلاتے رہتے ہیں لیکن ہر وقت نہ جانے کہاں مگن رہتا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ کوئی سامنے آ کھڑا ہوتا لیکن خبر نہ ہوتی۔ وہ آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتا، بازو پکڑ کر جھنجھوڑتا تو ذرا دیر کو میں متوجہ ہو جاتا مگر کچھ لمحوں بعد پھر وہی منظر آنکھوں میں آ بستے۔ سحر زدہ ان منظروں میں ہر سمت نور ہی نور تھا۔ یا شاید اندھیرا ہی اندھیرا...... نہیں بلکہ نور اور اندھیرے کے بین بین کچھ ایسا تھا کہ جو کو بہ کو پھیلا ہوا تھا۔

من میں نہ جانے کیا سمایا کہ مجھے کسی کی پرواہ نہ رہی۔ بلانے والے بلاتے مگر میں سنی ان سنی کر دیتا، ملنے والے ملتے مگر میں کسی کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ اندر ہی اندر کوئی تھا جو مجھے کہیں کھینچے لیے جاتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جو تم دیکھتے ہو وہ اصل میں وہ نہیں جو کہ تم دیکھتے ہو؛ جو کچھ تم سنتے ہو اس سے کہیں بہتر سننے کو کچھ اور بھی ہے؛ جن سے تم ملتے ہو ان

سے ملنے سے کہیں بہتر ہے کہ ان سے نہ ملو؛ جس جگہ تم رہتے ہو اس سے کئی گنا خوبصورت جگہیں تمہاری راہ میں ہیں، پس اٹھو اور چل پڑو، کسی کی طرف دھیان مت دو۔ سب فریب ہے، سب دھوکا ہے، مکاری ہے جو کچھ کہ دوسرے کہتے اور تم سنتے ہو۔ اصل وہی ہے جو تم سوچتے ہو۔ تم ہو، اس لیے کہ تم سوچتے ہو اور تم یا سوچتے ہو یہ تمہارے سوا اور کوئی بھی نہیں جان سکتا!!! پیار بھرے دریچوں سے میں اٹھا تو جانے کتنی ہی گلابوں بھری روشیں تھیں جو میرے قدموں تلے روندی گئیں، کتنے ہی خوشبو بھرے آنچل تھے جنہیں میں کانٹوں سے الجھا دیا اور کیا ہی مخملیں چہرے تھے جو مری سرد مہری کی کہر میں جم کے رہ گئے......مگر میں نہیں رکا۔ وہی کچھ کیا جو کہ میں نے سوچا اور میں نے کیا سوچا یہ میرے سوا کوئی بھی تو نہیں جانتا تھا۔ رقص کرتے پل پل بدلتے منظروں کے اس طرف کچھ بھی نہیں تھا، نہ ہی روشنی نہ اندھیرا۔

......دور تک پھیلی نیلی دھند میں چلتے چلتے برسوں بیت گئے۔ تھکن ہے کہ انگ انگ میں چابک مارتی پھرتی ہے۔ ٹیسیں رواں رواں سے شرارہ بن کے ابھرتی ہیں اور ہمت کے سنہرے بالوں کو جھلساتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ اجنبی فضاؤں میں خوف کے گدھ منڈلا رہے ہیں اور وحشت کے گہرے بادل ہیں کہ برابر بڑھے چلے آتے ہیں۔ اردگرد چلنے والوں کا ہجوم دم بدم بڑھ رہا ہے اور اندر ہی اندر بولنے والا بھی مسلسل بولے چلا جا رہا ہے مگر کوئی بھی نظر نہیں آتا، کسی ایک کے بھی خدوخال واضح نہیں۔ بس آوازیں ہی آوازیں ہیں......آوازیں ہی آوازیں......جن کا کوئی مفہوم نہیں۔ اک شور ہے...... بے ہنگم شور، جو ذہن کے پردوں پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا ہے۔ سب کے ساتھ میں بھی بول رہا ہوں، چیخ رہا ہوں اور قدم سے قدم ملائے آگے بڑھ رہا ہوں۔ نہیں بتا سکتا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ چلتے وقت میں نے اور تو بہت کچھ سوچا تھا اور جو سوچا تھا وہی کچھ کرتا بھی رہا مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اندر ہی اندر بولنے والا بھی اس بارے میں خاموش

ہے۔ میں واپس ہونا چاہتا ہوں مگر جانتا ہوں کہ واپسی کے تمام راستے مسدود ہیں۔ میں رکنا چاہتا ہوں مگر معلوم ہے کہ رکا تو بڑھتے ہوئے ہجوم کے قدموں تلے روندا جاؤں گا...... سوچ گم ہے، بولنے والا چپ ہے اور مایوسی کے گدھ ہیں قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ کرب کا اندھیرا نیلی دھند کو مسلسل نگل رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وحشت کی چلمنوں کے اس پار اندھیرا ہی اندھیرا ہے......گھپ اندھیرا۔

......میں کون؟

کرب کے اندھیرے پھیلنے لگیں تو انبساط کی کرنیں نہ جانے کہاں گم ہو جاتی ہیں کہ ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔ اداسیوں کی کڑی دھوپ جب نقاب اٹھاتی ہے تو نشاط کا کوئی سا سایہ بھی جائے پناہ نہیں بنتا اور غم کے پہاڑ جب میخیں بن کر سینۂ لرزاں میں پیوست ہوتے ہیں تو وہ انجماد جنم لیتا ہے کہ پھر حرکت کی ساری آرزوئیں دم توڑ جاتی ہیں۔ کاش کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا جو اس ہونی کو ان ہونی میں بدل دیتا۔ امید کی مدھم سی کرنوں کو ایسا دوام بخشتا کہ گھپ اندھیروں میں بھی جھلملاتی رہتیں۔ خواہش کے دم توڑتے سایوں پر ایسا قدغن لگاتا کہ کڑکڑاتی دھوپ میں بکھر بکھر کر بھی اپنے وجود سے گریزاں نہ ہوتے اور کوئی نغمہ......کوئی نغمہ ایسا ہوتا کہ راحتِ جاں بن کر ہمیشہ دھیمے سُروں میں مسلسل بجتا رہتا...... بجتا رہتا اور گہرے سناٹوں کو چیرتا رہتا۔

......کوئی نغمہ گہرے سناٹوں کو چیرتا رہتا، امید کی مدھم سی لو جھلملاتی رہتی، دھواں دھواں ہوتے سائے کہیں تو ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے مل جاتے......وہ سوچتا اور آپ ہی آپ بڑبڑاتا رہا۔ نہ جانے سوچ کا کون سا لمحہ تھا، درد کی کون سی گھڑی تھی، جس نے اسے پورے کا پورا جکڑا اور جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اسے یوں لگا جیسے اندر ہی اندر کوئی رہ پڑا ہے۔ ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں اور وہ جبر کی دیواروں سے سر مارتا پھرتا ہے مگر چپ چاپ، کوئی سسکی

نہیں، کوئی فریاد نہیں، کوئی آہ نہیں۔ لب بند ہیں کہ کہیں سناٹا ٹوٹ نہ جائے......سناٹوں میں دلدوز چیخیں بڑی ہولناک ہوا کرتی ہیں۔ وہ جانتا تھا، خوب جانتا تھا سو اندر کی آگ باہر نہ نکلی اور وہ روتا رہا۔ پتھر پتھر نہ رہے پگھل پگھل پانی بن گئے اور کیا ہی مضبوط فصلیں تھیں کہ آن کی آن میں تنکوں کی طرح بہہ گئیں۔ کرب اندر ہی اندر جھکڑ بن کر دندناتا رہا اور سارے منظر دھنکی ہوئی روئی کے گالے بن کر ہواؤں میں ہوا ہوتے رہے۔ طوفان تھما تو کچھ سکون ہوا۔ یوں لگا کہ جیسے کچھ نہ کچھ ایسا ہے جو نیا ہے۔ اڑتی ہوئی روئی دوبارہ سے یکجا ہوئی تو بہت سے نئے مناظر سامنے آ موجود ہوئے۔ اس نے سب پر نظر کی، اک اک کو دیکھا، ایک سرد آہ بھری اور چپ ہو رہا......افسوس کچھ بھی تو ایسا نہ تھا جیسا کہ اس نے سوچا تھا۔

بھلا میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا وہی ہوا ہے اور جو ہو رہا ہے اسی نے ہونا تھا۔ وہ بڑبڑایا۔ چہرے پر اداسیاں زرد روغن مل رہی تھیں اور ہونٹوں کا ارتعاش کچھ ایسا تھا جیسے وہ بول نہیں رہا قے کر رہا ہے۔ آنکھوں میں کرب کی سرخ لکیریں کچھ مزید واضح ہو گئی تھیں اور پھر تھوڑی دیر بعد واقعی اس نے قے کر دی۔ منہ سے جھاگ سی اڑ اڑ کر ارد گرد گرنے لگی۔ قبیح لفظوں کی گرانی نے اندر ہی اندر اودھم مچا رکھا تھا، راہ پاتے ہی ابل ابل کر باہر آنے لگے اور وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگا......میں......میں گندی نالی کا کیڑا ہوں،، گندگی کا ڈھیر ہوں، گوبر کی بُو ہوں، ٹھہرا ہوا غلیظ پانی ہوں، سڑی ہوئی بدبودار مٹی ہوں، کچرے سے جلنے والی آگ ہوں، خبیث چڑیلوں کے پیٹ سے نکلتی بُو ہوں......وہ چیختا رہا اور دیر تک اس کی یہی حالت رہی کہ لفظوں کی قے منہ بھر بھر کے خود اپنے ہی بدن پر اگلتا رہا۔ آخر کار چکرایا اور اوندھے منہ دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ مٹی نتھنوں کے اندر گھستی چلی گئی لیکن وہ اپنے آپ میں مست تھا۔ چیخنے کی طاقت نہ رہی تو بڑ بڑانے لگا......میں ہوں!! ہاں ہاں میں ہوں۔ میں......میں کولہو کا بیل ہوں، فیکٹریوں کا دھواں ہوں، ملکوں کا مالشی ہوں، گٹر کا ڈھکن ہوں، بجھے ہوئے چراغ کا بے نور پیندا

ہوں...... درد اندر ہی اندر بلبلاتا رہا۔ کرب آنکھوں اور منہ کے رستے چشمے کی طرح ابلتا رہا اور وہ اوندھے پڑا مدہوش ہوتا چلا گیا۔

وہ مدہوش ہو گیا تھا یا شاید نہیں ہوا تھا مگر اپنا بوجھ ہلکا کر چکا تھا...... بوجھ کہ جو صدیوں سے اس کے ساتھ چپکا پڑا تھا۔ آج صدیوں بعد پہلی بار اس کو ایسا حوصلہ ہوا تھا کہ خود کو ذرا سا ہلکا کرنے کی تدبیر کرے اور اندر ہی اندر مسلسل بڑھتی اس گرانی کو اگل دے جو افسوس بن کر اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ سو موقع پاتے ہی اس نے سب کچھ اگل دیا اور اب وہ زمین پر اوندھے منہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔

وقت نے گزرنا تھا سو گزرتا رہا۔ نہ جانے کتنے ہی اندھے لمحے اس کے اوپر سے ناچتے گاتے کودتے چلے گئے۔ انھی میں ایک کہ خوبصورتی میں سب سے بڑھ کر تھا اور آنکھیں بھی رکھتا تھا، چلتے چلتے رکا، اس کے منہ پر پانی کا چھینٹا دیا، ہولے سے مسکرایا اور کچھ دیر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اس کے بے حس و حرکت جسم میں جنبش ہوئی، ادھ کھلی آنکھوں سے امید کا شرارہ نکلا اور گم ہو گیا۔ لبوں سے نکلی ہوئی جان پھر سے لوٹ آئی اور وہ پھر سے بڑبڑانے لگا...... بھلا میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا وہی ہوا ہے اور جو ہو رہا اسی نے ہونا تھا مگر میں ہوں...... وہ بھی کہ جو مجھے ہونا چاہیے تھا اور وہ بھی کہ جو میں ہوں۔ کون ہے جو مجھے خواب دیکھنے سے روک دے، کس کی جرأت ہے جو میرے ارمانوں پر قدغن لگا دے۔ کوئی نہیں، کوئی بھی تو نہیں۔ میں ہوں، فقط میں...... میرے خواب میرے ہی ہیں، میرے خواب، رسیلے خواب...... صرف میرے ہیں، صرف اور صرف میرے۔ وہ سوچتا اور بڑبڑاتا رہا۔

روشنی کی ایک کرن اس کے اندر ہی اندر جگمگائی تھی اور اسے یوں لگا جیسے وہ عالم خواب میں ہے۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے اور آوازیں ہی آوازیں۔ کہیں سناٹا ہے نہ اندھیرا اور خوبصورت پھولوں کی قطاریں ہیں جن میں وہ ٹہلتا پھرتا ہے۔ بلکہ اسے یوں لگا

جیسے وہ خود ایک پھول ہے...... وہ بڑبڑایا...... ہاں میں پھول ہوں، میں چاہت کا نغمہ ہوں، میں چاند کی چاندنی ہوں، میں راگ کی راگنی ہوں، حسن کی چاشنی ہوں، عشق کی خوشبو ہوں۔ میں ہوں...... ہاں ہاں میں ہی سب کچھ ہوں۔ وہ چیخا اور اس کی آواز دور تک کلیاں بکھیرتی چلی گئی۔ میں وہ کچھ ہوں جو کہ مجھے ہونا چاہیے تھا اور میں وہ کچھ بھی ہوں جو مجھے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں ہی سب کچھ ہوں۔ وہ پھر چیخا۔ ہاں ہاں میں ہی سب کچھ ہوں...... خوبصورت مسکراتے ہوئے لمحے نے اسے آخری بار نظر بھر کے دیکھا اور چپ چاپ اپنی منزل کو روانہ ہوا۔ اندھے لمحوں کا سیلِ تند پھر سے رواں دواں ہو گیا۔ وہ زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا اور بڑبڑا رہا تھا، بڑبڑاتا رہا اور آخرکار چپ ہو گیا۔ ادھ کھلی آنکھوں میں کرب کی سرخی لہرائی، گہری ہوئی اور وہیں جم کے رہ گئی۔

بوسیدہ دیواروں پر کُھدے بَین

کھوئے جانے والے نو میں، مَیں آخری تھا۔ اردگرد اٹھی دیواروں میں کوئی فرق آیا، نہ کوئی اور چیز اِدھر کی اُدھر ہوئی۔ ٹپکتی چھت اب بھی ٹپکتی تھی۔ بڑی ڈیوڑھی کا جھکا ہوا چھجا، صحن کا اکھڑا پلستر اور باہر گلی میں دیواروں تک پھیلی کیچڑ بھری نالی ویسی کی ویسی تھی۔ بان کی ادھڑی ہوئی چارپائیوں کی چرچراہٹ اور اپلوں کے دھوئیں میں ملی غسل خانے سے آتی گندی بو بھی جوں کی توں تھی۔ بھوسے سے بھری چھوٹی کوٹھڑی سے مرغیوں کی کھسر پھسر، باہر بندھی بکری کی منمناہٹ، بلاجھجک اِدھر سے اُدھر اچھلتے چوہوں کی چِرچِر...... سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا برسوں سے...... لیکن ہم نو...... ہم نو کہ جو اچھے بھلے جی جان والے تھے، مجہول پرچھائیوں میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔ پہلے پہل ہم نے ایک دوسرے کا غم کیا اور رو پیٹ کے چپ ہو رہے، پھر اپنی اپنی پڑی تو ہر ایک اپنے آپ کو رویا، آخر آخر یہ حوالہ بھی ختم ہوا اور سسکیاں خشک ہوتے ہوتے اکھڑا ہوا پلستر بن گئیں۔ اب در و دیوار بین کرتے ہیں اور جو جس کونے میں دبکا ہوتا ہے وہیں بیٹھا بے آواز دھاڑیں مارتا ہے۔ آنسوؤں سے تر ہوا بند کمرے میں بھٹکتی پھرتی ہے لیکن سب کے ہوتے ہوئے بھی کمرہ خالی ہے۔ برسوں نوچی ہوئی کوکھ کی طرح خالی...... بانجھ پن کتھک ناچ ناچتا ہے۔

اوّل اوّل ہم نے جسے تحلیل ہوتے دیکھا وہ گہری آنکھوں اور گھنے خم دار بالوں والی

بوڑھی تھی۔اس وقت وہ بوڑھی نہیں تھی لیکن ہم سب میں محترم تھی سو مقدس بڑھاپا جوانی ہی میں اس کے ساتھ چپک کے رہ گیا۔لوریوں کے بیچوں بیچ وہ اکثر اپنی بھاری چادر جیسے دکھ بھی پلو سمیٹ سمیٹ سینچتی رہتی اور ہم کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھ جاتے کہ گلاب چہرہ چھلنی کی مانند چھدا پڑا ہے۔ چھیدنے والے اپنے ہی تھے۔ بھائی دور دیسوں جا بسا، ماں اس کے غم میں رو روا ندھی ہو گئی اور باپ چارپائی سے جا لگا،اوپر سے ایک لٹھ مار...... جس کے ساتھ اسے نتھی کر دیا گیا،سب پر بھاری تھا۔وہ بھی ہارنے والی نہ تھی۔سب سہتی رہی اور جیتی رہی۔جیتی رہی کہ اب بہت سی جانوں کی ڈوری اس کی نرم گرم سانسوں سے وابستہ تھی۔اس کے ساتھ والیاں قدم قدم ڈگ بھرتی چلیں وہ سر کے بل لمحہ لمحہ سرکتی رہی۔تنکا تنکا دانتوں سے سمیٹا اور ناخن ناخن جمع کر کے بوڑھے ماں باپ اور اپنے دامن میں پلتی سال بہ سال بڑھتی جانوں کا بن لکھا قرض اتارتی رہی۔نابینا ماں کی موت پر وہ خوب روئی،اتنا کہ ہماری ننھی آنکھیں بھی انگارہ بننے لگیں۔کچھ عرصے بعد باپ بھی چل بسا۔اب وہ مکمل طور پر لٹھ مار کے رحم و کرم پر تھی۔ لاٹھیاں برستیں،اسے بھی پڑتیں اور ہمیں بھی۔ ہمارے حصے کی سوغات اکثر وہ اپنی پھول کلائیوں پر سہتی۔ہمیں محفوظ رکھنے کو خود پٹ جاتی۔پٹتی رہی اور تنکا تنکا سمیٹ بال بال ابھرتے ننھے منے وجودوں کو پالتی رہی۔تلخیوں کے سخت تھپیڑوں کے باوجود کچی دیواروں والے چھوٹے سے گھر میں کوئی کھویا ہوا نہیں تھا۔چار بیٹیاں، تین بیٹے،ایک لٹھ مار اور ایک وہ۔سب پورے تھے۔جدھر سے بھی شمار کرو، روٹیوں کی چنگیر کے گرد آلتی پالتی مارے بیٹھا دائرہ مکمل تھا۔برسوں یہ دائرہ مکمل رہا۔پورے نو کے نو جی۔ہم میں کوئی کم نہ تھا۔

وقت کا پنچھی لمبا چکر کاٹ کے دوبارہ مقدس بوڑھی کے گھر آیا تو سات ننھے منے وجودوں میں سے پانچ کے قد جھکے ہوئے چھجے والی ڈیوڑھی کے برابر ہو چکے تھے۔ بھاؤ لگنے شروع ہو گئے۔مول تول کرنے والے آتے رہے جاتے رہے۔ بڑی نے تو صاف انکار کر دیا کہ میں جانے کی نہیں، چھوٹیوں کی بات کرو تو کرو۔چھوٹیاں نہ جانے کیا کیا چاہتی تھیں

لیکن دانتوں تلے زبان دابے چپ چاپ پتھر کا بت بنی رہیں۔ ایک جملہ ان دنوں بار بار سننے میں آیا کہ فیصلے تو اوپر ہوتے ہیں، فیصلے تو اوپر ہوتے ہیں۔ ہم تو بس...... معلوم نہیں اوپر والے نے کیا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن ادھر معاملہ طے ہوگیا۔ پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تو معلوم ہوا کہ لٹھ مار کی بیٹیوں کو لٹھ مار ہی ملے ہیں۔ مقدس بوڑھی اپنی جان پر سہے ستم اب ان کی زبانی سنتی تو صبر کے بھاری پتھر جو بڑی مشکل سے اس نے اپنے پپوٹوں پر تھام رکھے تھے، پگھل پگھل جاتے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنا پاؤں کاٹنے سے زخم کسی دوسرے کو آتا تو شاید ہم میں سے کوئی نہ کوئی ایسا کر گزرتا لیکن سب جانتے تھے کہ ایسا ہے نہیں۔ جبر کی دھند میں وجود قطرہ قطرہ گھلتے گئے۔ مقدس بوڑھی نے کچی اینٹوں کی دیوار کی طرح خم کھایا اور اپنے ہاتھوں پالی تین بوڑھیوں کو سہارنے کی کوشش میں مسلسل جھکتی چلی گئی۔ گہری آنکھیں دھندلے دائروں کے اس پار دیکھ رہی تھیں کہ ابھی چار باقی ہیں۔ اتنی تسلی خیر تھی کہ ان چار میں لڑکی فقط ایک ہے۔ روٹیوں کی چنگیر کے گرداگرد تین نقطے گم ہوگئے۔ دائرہ ٹوٹ گیا۔

بڑا لڑکا محنتی تھا۔ بھاگ دوڑ کے ایم اے پاس کیا اور اِدھر اُدھر سے کہہ کہلا کے سکول ماسٹر لگ گیا۔ لٹھ مار کی عقل ٹھکانے آئی تو ایک چھوٹی سی دوکان لگالی۔ دل پھرا تو دن بھی پھرنے لگے۔ کام چلا نکلا۔ لٹھ مار سے بابا دوکاندار بننے کے بعد اس نے خون پسینہ ایک کر دیا۔ سارے داغ دھل گئے لیکن ازلوں سے لکھے داغ دھونا کسی کے بس میں کب ہوتا ہے، پس جو ہونا تھا وہ ہوتا رہا اور جو اس سے بن پڑا وہ کرتا رہا۔ کھونٹی سے لٹکے تقدیر کے کوٹ میں سے ایک مردہ چوہا اس وقت گرا جب بڑے کی شادی مقدس بوڑھی کے دور دیسوں گئے بھائی کی بیٹی سے ہوئی۔ مدتوں پہلے پٹی ہوئی لکیر پھر ابھری اور پہلے سے زیادہ سخت جھٹکے دیتی معدوم ہوگئی۔ بڑا سکول ماسٹری چھوڑ دور دیسوں چلا گیا۔ مقدس بوڑھی اپنی ماں کی طرح چارپائی کے پینڈے سے یوں لگی جیسے پانی سے چھانی ہوئی کثافت...... گلاب چہرے پر خزاں کی کالی ہواؤں کی یہ چپت کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ کہر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے

لیے پرتول رہا تھا۔ زندگی کے نہ جانے کتنے ہی جاڑے اس نے اپنی گہری آنکھوں میں جذب کر لیے تھے لیکن اب کے پتلیاں پہلے ہی جل تھل تھیں۔ مگر وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ دھندلے ہالوں کے پیچھے اسے معلوم تھا کہ ابھی تین باقی ہیں۔

تین میں سے جو بڑا تھا وہ بھی سولہ جماعتیں پڑھ گیا اور اپنے بخت کی نکیل سے بندھا ایک کالج میں پڑھانے پر مامور ہوا۔ امیدوں کے گھگھو گھوڑے اب اس کے پلو سے بندھنے لگے۔ ایسی پکی گرہیں لگیں کہ اپنے تئیں جنہیں کھولنے میں مقدر کو بھی بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں۔ دھوم سے شادی ہوئی اور مقدس بوڑھی اور بابا دو کاندار نے گویا خزانوں کے در کھول دیے۔ پتھروں پر سے دھول چاٹ چاٹ کر گزارا کرنے والوں کے خزانے ہوتے ہی بھلا کتنے ہیں لیکن جو کچھ تھا وہ آنے والی کے قدموں پر پتی پتی نچھاور کر دیا۔ آنے والی آئی تو مقدر کو پاپڑ بیلنے کی ضرورت نہ پڑی، ساری گرہیں آپ ہی آپ کھل گئیں اور ایسی کھلیں کہ پھر دھاگے ذرا قریب آنے سے بھی رہے۔ کتے کی دم کو گویا کسی نے کلف لگا دی۔ مہارانی نے آتے ہی مہاراج سمیت سب کی چٹیا میں لونگ دھرے اور علیحدہ سے گھر بسا، یہ جا وہ جا۔ کچی دیواریں اس ہتک پر اپنا آپ نوچتی رہ گئیں۔ جھکے ہوئے چھجے والی ڈیوڑھی پہلے ہی ماتم کناں تھی اب ذرا اور بوسیدہ نظر آنے لگی۔ وقت کے کالے ناگ نے روٹیوں کی چنگیر پر چڑھ کر دھمال ڈالی اور غائب ہو گیا۔ دائرہ ٹوٹ چکا تھا۔

دائرہ ٹوٹ چکا تھا لیکن دو نقطے ابھی باقی تھے۔ مقدس بوڑھی باری باری دونوں کو دیکھتی، پلک پلک اپنے خواب سمیٹتی اور چارپائی کے پیندے میں ذرا سیدھی ہو بیٹھ رہتی۔ خواب بھی عجیب ہوتے ہیں، باؤلے کتے کی طرح حرام خور کبھی پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں اور آدمی کو دوڑائے رکھتے ہیں، لیکن ذرا کبھی گھوم کر دیکھو تو پیچھے کچھ بھی نہیں ہوتا، کتا ٹانگوں کے بیچ سے سرسراتا ہوا آگے نکل جاتا ہے، کبھی دائیں آ جاتا ہے کبھی بائیں۔ بڑھیا کے خوابوں کا کتا تو کب کا کہیں دور نکل چکا تھا لیکن بھونکنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی سو بڑھیا دونوں

نقطوں کو بار بار دیکھتی اور اندر ہی اندر سنہری لفظوں کے جھومر سجاتی رہتی۔ مگر جانتی تھی کہ بانچھ پن کی چادر ایک بار تن جائے تو پھر جانے کی نہیں، سب چاٹ لیتی ہے۔ ان کا بھی وہی بننا ہے جو ہمیشہ سے بنتا چلا آیا ہے۔ پہلے والے کھوئے گئے۔ ہم نے اپنی باری پر اپنا آپ چٹوایا، اب ان کا نمبر ہے۔ قصور تو کسی کا بھی نہیں، نہ پہلے والوں کا، نہ ہمارا نہ ان کا۔ ہم تو بس اپنا آپ چٹوانے ہی کو یہاں آتے ہیں۔ مقدس بوڑھی بڑبڑاتی رہتی اور چارپائی کے پیندے سے لگی تیز بارش میں چکنی مٹی کی طرح ہولے ہولے گھلتی رہتی۔

باقی دو میں پہلا نمبر لڑکی کا تھا۔ سب کو دیکھ دیکھ عین جوانی ہی میں اسے غم کی دیمک آ لگی اور ایسی لگی کہ کچی دیواروں کے ساتھ بھربھری مٹی کی طرح وہ ریزہ ریزہ ہو کے بیٹھ رہی۔ کسی میں جھاڑ پونچھ کی ہمت نہ تھی۔ مقدس بوڑھی، بابا دوکاندار اور سب سے بڑی لڑکی جواب مقدس بوڑھی سے کسی طرح کم نہ تھی، اس بھربھری مٹی میں گھل مل گئے۔ کرب کا بھورا بھنورا امید کی اجڑی شاخوں پر گھمر گھمر گھومتا رہا۔ دردسینہ پیٹتا رہا۔ دوسرے نمبر پر میں تھا۔ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھتے میری طرف...... کہ اب سالا میں ہی بچ رہا تھا۔ سب کھوئے گئے، میں آخری تھا...... میں آخری تھا لیکن نہ جانے کب، کیوں اور کیسے مجھے ایک رات تقدیر کے سائیں فقیرے نے اچک لیا اور ایسا اچکا کہ میں، میں نہ رہا۔

بانچھ پن کی پھیلی چادر نوچ کر جب میں ٹپکتی چھت تلے سے نکلا تو سائیں فقیرا آگے آگے تھا۔ بھول بھلیوں کے بیچوں بیچ ہم نے راستے کھودے اور امکان کی آخری حد تک سب روندتے چلے گئے۔ نوک نوک ابھرے جنوں کو مدوّر کرتے کرتے میں شل ہو گیا لیکن رُواں رُواں سرشار تھا۔ مسلسل چلے جانے کی سرشاری، زیر کر لینے، قابو پا لینے اور سب کچھ مسل کے پھر نیا بنا دینے کی سرشاری...... سو میں بھول گیا ان کو اور بھول گیا وہ سب کچھ کہ جو وابستہ تھا ان سے اور جو کہ میرا سب کچھ تھا...... میں بھول گیا اور پھر بھولتا ہی چلا گیا، لیکن سرشاری...... لفظوں کا جادو انگلیوں میں پور پور اترا تو چاندنی میں نہائی راتوں میں آخری

پہر کے نروان کا تاج محل قدموں تلے تھا۔ گیان کی برفیلی چٹانوں کے اس پار کا حیرت کدہ بھی سر ہوتا چلا گیا اور ناموجود کے آتشیں دائروں میں دھواں دھواں ہوتے عکس بھی شبیہیں بن بن سامنے آموجود ہوئے۔ یہیں کہیں انہی شبیہوں کے آس پاس مجھ سے کوئی بھول ہوئی۔ بھول نہ جانے کیا تھی لیکن بس بھول ہوگئی۔ آن کی آن میں سائیں فقیرے نے چولا بدلا اور اچک کر ہوا میں یوں اچھالا کہ برسوں دھندلے دائروں میں غوطے کھاتے، ڈوبتے ابھرتے گزر گئے۔ نہیں معلوم کہ کیا ہوتا رہا اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کہاں، کیوں، کیسے!...... بس مسلسل ڈبکیاں تھیں اور میں...... برسوں گزر گئے...... شمار کون کرے۔

دائروں میں سے تیر کھائے ہوئے زخمی پرندے کی مانند دھم سے میں اوندھے منہ گرا تو جھکے ہوئے چھجے والی ڈیوڑھی سامنے تھی۔ سب ویسے کا ویسا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا، بان کی ادھڑی چارپائیاں ساکت، اکھڑا ہوا فرش چپ، ہر چیز جوں کی توں۔ کچی دیواروں کی بھربھری مٹی ریزہ ریزہ، چھت پر جالے، سب ویسے کا ویسا...... اندر داخل ہوا تو پہلی کراہ مقدس بوڑھی کی چارپائی کے پیندے سے ابھری۔ میں ادھر متوجہ ہوا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ پلٹ کر بابے دوکاندار کی چارپائی کو دیکھا تو کراہ ایک بار پھر ابھری...... ایک بار پھر...... اور اس کے بعد گویا بوسیدہ دیواروں کے ضبط کے سارے بندھن کرچی کرچی ہو گئے۔ دھاڑیں مار مار کر روتی دیواریں مجھ سے چمٹ گئیں، خالی چارپائیاں اچھل اچھل اپنا سینہ پیٹنے لگیں اور فرش پر بکھری ریزہ ریزہ کچی مٹی سسکاریں بھرتی میری ٹانگوں سے آلپٹی۔ برسوں کے چھائے بادل کڑک کڑک برسے۔ جل تھل ہوگیا۔ وہ آٹھ تھے اور نواں میں۔ سایوں میں وجود کو برقرار رکھنا مشکل ہوگیا...... بہت ہی مشکل۔ وہ آٹھ تھے اور نواں میں۔ میں نے بہت دیر کر دی۔ بوسیدہ دیواروں کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے میں نے سوچا۔ آہ میں نے بہت دیر کر دی۔ تحلیل ہونے سے چند لمحے پہلے باہر ایک دل دوز چیخ ابھری۔ دیکھا تو صحن میں اپلوں کی ڈھیری کے قریب روٹیوں کی خالی چنگیر اوندھی پڑی تھی۔ وقت کا کالا ناگ اس پر بیٹھا دھمالیں ڈال رہا تھا۔

نہ جانے کون ہے وہ

سنتے سنتے کان پک گئے۔ آواز ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔ ایک ہی آواز ایک ہی طرح کے الفاظ اور ایک ہی طرح کی باتیں۔ خدا جانے بولتے بولتے اس کے ہونٹ کیوں نہیں پکتے۔ کبھی تو ایسا ہوا ہوتا کہ اس کی آواز پتھر بن جاتی، ایسا پتھر جو اس کے منہ میں اٹک کے رہ جاتا۔ یا الفاظ امرت بن جاتے کہ سننے سے کانوں میں رس گھلتا۔ یا مفہوم ہی کبھی صورت بدل لیتا، آپ ہی آپ ست برگے کی خوشبو میں ڈھل کر ذہن کو معطر کر دیتا۔ لیکن نہ جانے کب سے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کوئی نہ جانے کون ہے جو مسلسل چیخے چلا جا رہا ہے۔ پل پل ساتھ رہتا ہے اور چیختا ہے۔ چیختا ہے تو کانوں کے پردے پھٹے پڑتے ہیں۔ کبھی سرگوشیاں کرنے لگتا ہے اور کبھی ہونٹوں پہ ہونٹ رکھ کے یوں ساتھ چپکتا ہے کہ گویا میرے ہی بدن کا حصہ ہے۔ رگوں میں دوڑتا لہو سانپ بن کر لہرانے لگتا ہے۔ نسیں یوں پھولتی ہیں کہ بس پھٹ پڑنے کی کسر رہ جاتی ہے۔ اس کی بدبودار سانسیں اندر ہی اندر جسم کی دیواروں سے سر پٹختی پھرتی ہیں اور پھر کہیں سے اچانک وہ ابل پڑتا ہے۔ ابل پڑتا ہے اور قہقہے لگاتا ہے۔ قہقہے، سسکیاں اور چیخیں۔ تپش برف بن جاتی ہے تو دفعان ہو جاتا ہے۔ مریل کتے کی طرح نڈھال ہو کے پڑ رہتا ہے۔

اوّل اوّل جب اس نے چیخ ماری اور میں نے سنی تھی تو شاید کم سنی سے ذرا آگے کا سال تھا۔ میرے ساتھ چور سپاہی کھیلتی سنہرے بالوں والی اچانک مجھ سے آ ٹکرائی تھی اور

مجھے اس کا ٹکرانا اچھا لگا تھا۔ اس وقت وہ چیخا تھا لیکن اس وقت اس کی آواز سارنگی کے سروں سے بھی زیادہ بھلی لگی تھی۔ اس کی چیخ میں جادو تھا اور جی چاہتا تھا کہ وہ بار بار چیخے اور میں سنوں...... اور دیر تک سنتا رہوں۔ اس نے بھانپ لیا، میرے ساتھ ہو لیا، ایسے کہ جیسے ازلوں سے میرا ساتھی ہو۔

کچھ ٹھیک سے تو یاد نہیں لیکن گمان گزرتا ہے کہ شاید واقعی ہم ازلوں کے ساتھی ہیں۔ کچھ دھندلے سے نقش تھے کہ جب سے قریب آیا تھا واضح تر ہو رہے تھے۔ یاد پڑا کہ صدیوں پہلے جب میں اور سنہرے بالوں والی دور کہیں بہت دور رہا کرتے تھے تو وہ اس وقت بھی ساتھ تھا۔ نظروں سے اوجھل، دور درختوں کے جھنڈ میں بیٹھا بانسری بجایا کرتا۔ ایسی دھنیں اڑاتا کہ ساری وادی ترنگ میں آ جاتی۔ سُر کانوں میں رس گھولتے اور ہم دونوں پہروں بیٹھے سنتے اور سر دھنتے۔

......ہم دونوں پہروں بیٹھے سر دھنتے اور اس دن جب ہم ٹکرائے تھے تو یہ وہی تھا جو چیخا۔ اب درختوں کے جھنڈ تھے نہ وادی اور نہ بانسری لیکن اس کی چیخ بانسری کے سُروں سے کچھ کم نہ تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے سُر قہقہوں اور قہقہے چیخوں میں بدلتے چلے گئے لیکن خبر نہ ہوئی۔ سنہرے بالوں میں رات کے سائے سانپ بن کر لہرائے تو معلوم ہوا کہ ہم دونوں درختوں کے اسی جھنڈ میں ہیں کہ جس میں وہ تھا۔ اب وہ نہیں تھا اور ہم تھے، یا شاید وہ بھی تھا اور ہم بھی تھے۔

کہتے ہیں کسی علاقے میں اللہ کا ایک نیک بندہ رہا کرتا تھا۔ لوگوں نے سوچا کیوں نہ اس سے فیض حاصل کیا جائے۔ ایک دن سب اکٹھے ہوئے اور اس کے حضور جا بیٹھے۔ سلام دُعا کے بعد فقیر نے آنے کا سبب پوچھا تو لوگوں نے عرض کیا، حضور! کچھ ارشاد فرمائیں کہ ہم بھی آپ سے ہو جائیں۔ فقیر مسکرایا اور کہا، لوگو! اپنے دل صاف رکھو۔ لوگ حیران ہوئے۔ پوچھا، حضرت کیوں؟ فرمایا! دل حوض کی مانند ہے اور باقی اعضا ندیاں۔ حوض میں پانی صاف ہوگا تو ندیوں میں بھی صاف ہی آئے گا۔ لوگ عش عش کر اٹھے۔ کہنے لگے، حضرت کچھ اور

فرمایئے۔ فقیر پھر مسکرایا اور کہا، لوگو! کم کھایا کرو۔ پیٹ بھرا ہو تو بلائیں آتی ہیں۔ لوگ چپ چاپ اٹھے اور اپنے گھروں کی راہ لی...... گھروں کی راہ لی کہ دونوں باتیں مشکل تھیں۔

معلوم نہیں اس حکایت کا اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے اور یہ بھی نہیں خبر کہ اُس کے ذکر میں یہ حکایت یاد کیونکر آئی۔ فقط اتنا معلوم ہے کہ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ وہ کون ہے؟ نہ میں نے اس سے پوچھا نہ اس نے کبھی بتایا۔ میں پوچھتا بھی کیوں اور وہ بتاتا بھی کیسے کہ اس کا کام تو بس چیخنا ہے۔ عرصہ ہوا اس کے سُراب یہی ہیں کہ ہمہ وقت چنگھاڑتا رہتا ہے اور عرصہ ہوا کہ میں سنتا ہوں۔ سنتے سنتے کان پک گئے۔ ایک ہی طرح کی آواز، ایک ہی طرح کے الفاظ اور ایک ہی طرح کی باتیں۔ خدا جانے بولتے بولتے اس کے ہونٹ کیوں نہیں پکتے۔

نہ جانے کیوں گمان گزرتا ہے کہ سارا قصور سنہرے بالوں والی کا ہے۔ نہ مجھ سے ٹکراتی نہ وہ چیختا۔ لیکن شاید قصور میرا ہی ہے کہ چور سپاہی کھیلنے کا اسے میں نے ہی تو کہا تھا۔ نہ میں اسے کہتا، نہ وہ مجھ سے ٹکراتی اور نہ وہ چیختا۔ لیکن نہیں سارا قصور تو اسی کا ہے کہ جو چیخا اور وہ کیوں چیخا۔ یہ نہیں معلوم۔

پاس ہی کوئی پرچھائیں لہرائی ہے۔ یوں لگا ہے کہ گویا کوئی سنہرے بال بکھرائے قریب تر ہوا جا رہا ہے۔ ادھر ہی کہیں کوئی اندر ہی اندر چنگھاڑ رہا ہے۔ لہو میں سانپ بن کر لہرا رہا ہے، پھنکارتا پھر رہا ہے۔ سنہرے بالوں میں رات کے سائے ڈھل رہے ہیں۔ درختوں کا جھنڈ اور چیخیں۔ چیخیں ایسی کہ کان پھٹے جاتے ہیں۔ رات کے سائے ڈھل رہے ہیں اور وہ...... وہ تپش بن کر کلبلا رہا ہے۔ خیال آتا ہے کہ کاش اس کی چیخیں امرت بن جائیں کہ سننے سے کانوں میں رس گھلے، یا ایسا ہو کہ مفہوم آپ ہی آپ ست برگے کی خوشبو بن جائے کہ ذہن کو معطر کر دے۔ لیکن نہیں۔ ایسا کچھ نہ ہوگا۔ ایسا کچھ نہ ہوگا کہ پہلے بھی تو ایک عمر سے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ چیخ رہا ہے۔ جسم کی دیواروں سے سر پٹخ رہا ہے۔ اب وہ ابلے گا اور جب تپش برف بن جائے گی تو تبھی کہیں دفعان ہوگا کہ پہلے بھی تو ایک عمر سے ایسا ہی ہوا ہے۔

دریا بُردھوتی کہانیاں

صدیوں سے یہ پُل ایسا ہی ہے۔ دو پہاڑوں کے بیچ ہولناک بلندیوں پر ہوا میں ڈولتا ہوا۔ نیچے دُور اتھاہ گہرائیوں میں اُبلتے پانی کا چنگھاڑتا ہوا دریا...... کہ جس کی لپٹوں سے بچ کر پار اترنے کا واحد راستہ یہ پُل ہے۔ نہ جانے کب، کس نے اسے کیسے بنایا، معلوم نہیں، لیکن کہانیاں ہیں کہ اس کے بارے میں بہت سُنی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اوّل اوّل دور دیسوں کا ایک بادشاہ ادھر سے گزرا تھا۔ پہلے دریا عبور کرنے کی ٹھانی، چند آدمی ہی اترے تھے کہ حکم ہوا رک جاؤ...... رک جاؤ کہ ہر اترنے والا جل کر کباب ہوا جاتا ہے۔ وزیروں مشیروں کو جمع کیا۔ پہلے دربارِ خاص آراستہ اور پھر دربارِ عام۔ سب کے سب بادشاہ سلامت پر جل مرنے کو تیار تھے۔ عرض گزار ہوئے کہ حضور حکم ہو تو بندے اپنے جسموں کو چُن دیں، رستہ بن جائے گا اور یوں شاہ شاہاں کی سواری بسلامت پار اُتر جائے گی۔ بادشاہ زیرک تھا۔ سوچا اگر غلام ہی نہ ہوں گے تو غلامی کون کرے گا۔ حکم دیا کہ نہیں بلکہ ایسا کرو کہ ہمارے لیے اس پل کو ازسرِ نو تعمیر کرو۔ اس میں عجوبہ یہ رکھو کہ جو ہمارا ہے وہ پار اترے اور جو ہمارا نہیں وہ دریا بُرد ہو۔ مصاحبین میں باکمال لوگوں کی کمی نہ تھی سو تھوڑے ہی عرصے میں حسبِ خواہش پُل تعمیر ہو گیا۔

پُل تعمیر ہوا تو قافلے کے کوچ کا پروانہ جاری کر دیا گیا۔ نقارے بجنے لگے۔ سب

سے آگے حبشی غلام تھے کہ جن کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ ان کے پیچھے زرہ بند دستے، پھر گھڑ سوار، پھر فیل بان اور ان سے پیچھے درباری، امراء، وزرا اور مصاحبین خاص درجہ بدرجہ صف آرا ہو گئے۔ انہی کے درمیان بادشاہ سلامت اور ملکہ کی سواری تھی۔ ہر ایک دل ہی دل میں خوفزدہ تھا کہ خدا جانے کیا ہو۔ سب کی زباں پر بادشاہ سے وفاداری کے ترانے تھے۔ بادشاہ خوش تھا کہ چلو آج کھرے کھوٹے کا فیصلہ ہو جائے گا اور غداروں سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے گی۔ راوی کہتا ہے کہ ہوا یوں کہ کچھ تو آغاز ہی میں گر پڑے اور جوں جوں قافلہ آگے بڑھتا رہا گرنے والے گرتے رہے اور بچنے والے آگے رواں دواں رہے۔ وسط میں پہنچ کر نہ جانے کیا ہوا کہ سارے کا سارا قافلہ بادشاہ سمیت دریا بُرد ہوا اور ان میں سے ایک بھی نہ بچا۔

ان میں سے ایک بھی نہ بچا...... سب نے نابود ہونا تھا سو وہ ہو گئے۔ برسوں بیت گئے۔ پل ہولناک بلندیوں پر ہوا کا جھولا جھولتا خستگی کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا۔ نیچے ابلتا ہوا دریا منہ کھولے پھنکارتا اور پہاڑوں سے سر ٹکراتا اپنے سفر پر رواں دواں رہا۔ وقت کا بہاؤ بھی اس کے ساتھ ساتھ کندھے سے کندھا ملائے چلتا رہا۔ دونوں چلتے رہے کہ ازل سے ان کا کام بس یہی تھا۔

کہتے ہیں برسوں بعد ادھر سے پھر کسی بادشاہ کا گزر ہوا۔ پل کی سینہ بسینہ چلتی کہانی اس تک پہنچی تو متجسس ہوا۔ جوان خون تھا، سپاہ ساتھ تھی اور حوصلے بلند۔ سو اس نے اعلان کیا کہ مابدولت اس پل پر سے پار اتر کر دکھائیں گے۔ سب کو جمع کیا۔ دربار عام میں سب نے تائید کی اور یک زبان ہو کر شاہ عالم پناہ کی غلامی میں سب کچھ کر گزرنے کا حلف اٹھایا۔ دربارِ خاص منعقد ہوا تو وزیر باتدبیر کہ جو سن رسیدہ اور نہایت عاقل تھا کچھ کہنے کو ملتمس ہوا۔ التماس بارگاہِ شاہی میں قبول ہوا تو آداب بجا لایا۔ کہنے لگا! حضور کا اقبال بلند ہو، عالی جاہ اس غلام کے منہ میں خاک اگر حضور کی تعریف کے سوا کچھ کہے۔ یہ عالم پناہ کی غریب

پروری ہے کہ مجھ ہیچ کو سرفراز فرمایا۔ جان کی امان پاؤں تو عرض فقط اتنی ہے کہ پل خستہ ہے اس کو از سرِ نو تعمیر کیا جائے اور نقائص کو بھی دور کر لیا جائے۔ تاکہ میری زبان کو آگ لگے کہیں کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ وزیر کا مشورہ بادشاہ کو پسند آیا، حکم ہوا کہ پل کو از سرِ نو تعمیر درست کیا جائے اور اس میں جو اپنے پرائے کی تمیز رکھی گئی تھی، ختم کر دی جائے۔ جو ہمارا ہے وہ بھی پار اترے اور جو ہمارا نہیں ہے وہ بھی۔ بادشاہ کے فیصلے پر سبھی کے چہرے کھل اٹھے۔ آفریں آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں اور اگلے ہی دن سے پل کی تعمیر شروع ہو گئی۔

پل کی تعمیر شروع ہوئی، باکمالوں اور ہنرمندوں نے تھوڑے ہی عرصے میں پل میں پہلے سے موجود نقص بھی دور کر دیئے اور سلیقے سے بنا سجا بھی دیا۔ جب سارا کام مکمل ہو گیا تو نوبت خانے میں نقارے بجا دیئے گئے۔ قافلہ صف آرا ہو گیا۔ سب سے آگے بہادر بادشاہ، مصاحبینِ خاص اور درباری تھے۔ پیچھے تلوار بردار غلام اور آخر میں دیگر سپاہ۔ قافلہ رواں ہوا اور شاہانہ کروفر سے چلتا ہوا پل کے درمیان جا پہنچا۔ راوی کہتا ہے کہ جب قافلہ وسط میں پہنچا تو نہ جانے کیا ہوا کہ با شاہ اور مصاحبین پر تلوار بردار غلاموں نے حملہ کر دیا اور آن کی آن میں سب کو تہس نہس کر دیا، پھر پیچھے والوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ گھمسان کا رن پڑا تو پل کے تختے اکھڑ گئے اور سب کے سب دریابُرد ہوئے اور ان میں سے ایک بھی نہ بچا۔ سب کو نابود ہونا تھا سو وہ ہو گئے۔

کہانی سینہ بسینہ آگے چلتی ہے۔ کہتے ہی صدیوں سے یہ پل ایسا ہی ہے۔ برس ہا برس کی سینکڑوں کہانیاں اس سے وابستہ ہیں۔ ہر کہانی بالآخر دریابُرد ہو جاتی ہے۔ صدیوں سے نہ پُل ٹوٹتا ہے نہ دریا سوکھتا ہے اور نہ پار اترنے کی خواہش رکھنے والوں کے حوصلے پست ہوتے ہیں۔

سننے والوں کا تعجب سینہ تان کے باہر آیا تو راوی عرض گزار ہوا۔

جاننے والو! جاننا اک عذاب ہے اور نہ جاننے والو! سن لو! نہ جاننا اس سے بڑا

عذاب ہے۔ پُل صدیوں سے جھول رہا ہے اور جھولتا رہے گا۔ دریا چل رہا ہے سو چلتا رہے گا۔ برس ہا برس سے عذاب جھیلنے والے آ جا رہے ہیں سو آتے جاتے رہیں گے۔ کہانی سینہ بہ سینہ چلتی رہی ہے...... چلتی رہے گی...... دریا بُردھوتی رہے گی۔ جاننے والو! نہ جاننے والوں کو بتا دو اور نہ جاننے والو! چپ ہو رہو...... چپ ہو رہو کہ دو پہاڑوں کے بیچ ہولناک بلندیوں پر ہوا میں ڈولتے پل پر سب برابر ہے...... جاننا نہ جاننا سب برابر ہے۔

شوقِ سیرِ مژگاں

وہ ہر روز ایک افسانہ لکھتا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جب سب سو جاتے تو وہ اٹھ بیٹھتا۔ کاغذ قلم سنبھالتا اور لکھنا شروع۔ لکھتا جاتا اور کاٹتا جاتا اور لکھتا جاتا۔ کہانی ختم ہوتی تو غبار اترتا لیکن عجب تھا کہ اگلے ہی لمحے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ کہانی تو وہیں کی وہیں ہے۔ جو لکھنا تھا وہ تو لکھا ہی نہیں گیا۔ غبار پھر ویسے کا ویسا ہو جاتا۔ پس وہ انتظار کرتا اگلی رات کا اور ارادہ باندھتا خوب مضبوطی سے کہ اب وہ صرف وہی کچھ لکھے گا جو وہ لکھنا چاہتا ہے۔ خوب سوچ بچار کرکے ایک نقطہ پکڑتا اس کا کہ جو کچھ اس نے لکھنا ہے اور تہہ کر کر رکھتا اسے اپنے سرہانے کے نیچے اور مطمئن ہو کے سو رہتا۔ دن اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے گزر جاتا اور آ جاتی رات اور بیٹھ رہتا وہ پچھلے پہر کے انتظار میں، تا کہ لکھ سکے وہ سب کچھ کہ جو وہ لکھنا چاہتا ہے مگر ہر بار یہی ہوتا کہ لکھ چکنے پر اسے یوں لگتا کہ گویا کچھ بھی نہیں لکھ پایا۔

من میں آئی کہ ہو نہ ہو یہ پچھلے پہر کا خمار ہے جو اپنے دھیمے سُروں میں سب بہالے جاتا ہے اور کہانی کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ چاہیے کہ میں پہلے پہر بیٹھا لکھا کروں اور پچھلے پہر آرام کروں۔ شاید یوں ہی مراد بر آئے اور لکھا اَن لکھا ایک ہو جائے۔ سو ایک رات اس نے کچھ نہ لکھا اور ارادہ باندھا اگلی رات کے پچھلے پہر کا اور سو یا کیا رات بھر۔ دن کو اطمینان

دلایا اپنے آپ کو اور روزمرہ کاموں میں لگا رہا۔ کچھ نہ سوچا اور نہ دھیان دیا اس کی طرف کہ جو اس نے لکھنا تھا۔ پس مگن رہا اور جب رات کا پہلا پہر آیا تو وہ اطمینان سے کاغذ قلم سنبھال اپنی مخصوص جگہ پر آ بیٹھا اور لکھنا شروع کر دیا۔ آج کوئی نقطہ پہلے سے باندھا ہوا سرہانے کے نیچے نہیں رکھا تھا، رات کا پچھلا پہر بھی نہیں تھا۔ آنکھیں بوجھل تھیں نہ خمار کا کوئی نشان تھا۔ بیٹھتے ہی جو نقطہ سب سے پہلے ابھرا اسی کو سامنے رکھ کر وہ لائنوں پہ لائنیں کھینچتا چلا گیا۔ لکھتا رہا اور سوچتا اور لکھتا رہا۔ جب آدھی رات اِدھر اور آدھی اُدھر ہوئی تو کہانی مکمل ہو چکی تھی۔ غبار اتر گیا، جان چھوٹ گئی۔ اس نے کاغذ تہہ کر کے ایک طرف رکھے اور سونے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ آج خوب جی بھر کے سوئے۔ آج سب لکھا گیا، وہ سب کچھ کہ جو برسوں لکھنے میں نہ آتا تھا۔ آج سب کچھ...... اگلے ہی لمحے اترا ہوا غبار پھر سے اُمڈ آیا۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں لکھا...... وہ بڑبڑایا...... میں نے جو لکھا تھا وہ تو ابھی میرے پاس ہے۔ کاغذ پر جو لکھا ہے وہ بھی میرا ہی ہے لیکن میں تو کچھ اور...... میں تو کچھ اور لکھنا چاہتا تھا۔ تو گویا میں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ ہاں کچھ بھی نہیں لکھا۔ وہ سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے صبح ہو گئی۔

صبح دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ ابھرتے سورج کی طرف منہ کیے کھڑا ہے اور انگلی اپنے سینے پر دھرے بڑبڑا رہا ہے۔ راہ چلتوں میں سے جو بھی دیکھتا، حیران ہوتا مگر کسی نے اسے بلانے کی کوشش نہ کی۔ ایک بڑے میاں جی کہ ریش جن کی پیری کی وجہ سے سفید ہو چلی تھی لاٹھی ٹیکتے ادھر آ نکلے۔ دیکھا تو متعجب ہوئے کہ الٰہی ماجرا کیا ہے۔ یہ کون ہے اور صبح ہی صبح کیا کیے جا رہا ہے۔ خدا جانے کوئی جادو وادو کا چکر ہے یا عشق کی آتش کا گھبرایا ہوا ہے بیچارہ۔ ہو سکے تو معلوم کیا جائے کہ میاں کاہے کو یوں انگلی دھرے کھڑے ہو اور کیا بُڑبُڑاتے ہو۔ کچھ ہمیں بھی پتہ چلے۔ یہ ارادہ کر کر بڑے میاں اس کے قریب ہوئے، لاٹھی سے ٹھوکا دیا اور بولے، ارے میاں سنتے ہو، ہم سے کوئی بات وات کرو، کوئی رمز ہو تو شاید تمہارے

وسیلے ہم بھی جان لیں۔اس نے بڑے میاں کو گھور کے دیکھا اور پھر اپنے آپ میں مگن ہو گیا۔ پہر چڑھے واپس ہوا تو چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا گویا کوئی بڑا نروان پالیا ہے۔

اگلی صبح پیر سائیں کے مزار پر اس نے مجمع لگا لیا۔ دھما دھم ناچے چلا جا رہا تھا۔ سبز چوغہ پہنے، پیروں میں گھنگرو باندھے وہ آنکھیں بند کیے تھرک رہا تھا اور مزار پر حاضری کے لیے آنے والے دائرہ بنائے اس کے گرد کھڑے دیکھ رہے تھے۔ حیران تھے کہ معلوم نہیں کیا معاملہ ہے۔ مزار کا گدی نشین بھی مجمع دیکھ کر باہر آ گیا۔ ناچنے والے تو یہاں روز ہی ناچتے ہیں۔ من چلے کا سودا ہے یہ، جس کو بھلا لگتا ہے وہ ناچتا ہے اور جسے نہیں لگتا وہ نہیں ناچتا۔ لیکن آج یہ ناچنے والا کچھ عجیب عجیب سا لگتا ہے۔ یہ بابو لوگ کب سے ناچنے لگے، لگتا ہے کوئی خاص بات ہے......گدی نشین نے سوچا اور مجمع میں آ شریک ہوا۔ لوگ سرکنے لگے مگر ناچنے والا ناچتا رہا۔ ٹہوکا دینے والوں نے ٹہوکا بھی دیا لیکن وہ مگن تھا۔ گھور کے ذرا اک پل انہیں دیکھا اور پھر جو کچھ کر رہا تھا، کرتا رہا۔ سورج سر پر آیا تو وہ چپکے سے غائب ہو گیا۔ کسی نے اسے جاتے نہیں دیکھا وہ وہاں نہیں تھا۔

کئی روز تک وہ نظر نہ آیا اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ ایک دن شام کے وقت ایک گلی میں بچوں کا شور اُٹھا۔ تالیاں پیٹتے، قہقہے لگاتے، شرارتیں کرتے وہ ایک سودائی کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سودائی ان سے بچنے کے لیے کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر بھاگتا مگر کہیں بھی اسے عافیت نہ ملتی۔ روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا۔ بال پراگندہ اور کپڑوں پر جگہ جگہ گندگی لگی ہوئی۔ راہ چلتوں میں سے کسی نے اسے حیرت سے دیکھا، بچوں کا جھڑکا لیکن سب کی سنی اَن سنی ہو گئی۔ بڑے میاں لاٹھی ٹیکتے مسجد کو روانہ ہو رہے تھے۔ یوں ایک سودائی کو بچوں کے ہاتھ کھلونا بنتے دیکھا تو رہا نہ گیا۔ لاٹھی کھنکھٹائی اور ہش ہش کر کے سب کو بھگا دیا۔ سودائی ایک کونے میں دبک کر ہانپنے لگا۔ روٹی کا خشک ٹکڑا چبائے نہ چبتا تھا مگر وہ نگل رہا تھا اور سہمی ہوئی نظروں سے بڑے میاں کو دیکھ رہا تھا۔ بڑے

میاں نے اسے پچکارا، قریب آئے، دلاسہ دیا اور بولے! چلو میاں اٹھو اور ادھر میرے گھر کے پاس جا بیٹھ رہو، میں ابھی آتا ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ مسکرائے اور آگے بڑھ گئے۔ ایک بار بھی مڑ کے نہ دیکھا، گویا انہیں یقین تھا کہ جو کہہ دیا ہے، ہو جائے گا۔ حیرت کی بات کہ بڑے میاں کے اوجھل ہوتے ہی وہ اٹھا اور ان کے گھر کے دروازے کے پاس آ کر بیٹھ رہا۔ لڑکے بالے بدستور گلی میں موجود تھے مگر عجب تھا کہ کسی کو اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔

بڑے میاں واپس آئے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دبائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ گھر میں داخل ہو کر اوّل اسے نہانے دھونے کا حکم ہوا۔ نئے کپڑے دیئے گئے، کھانا کھلایا گیا اور پھر رات کا پہلا پہر گزرنے نہ پایا کہ وہ بڑے میاں کے سامنے دوزانو بیٹھا اپنا آپ کھول رہا تھا۔ بڑے میاں انہاک سے اسے سنتے اور مسلسل اس کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتے رہے۔ بات ختم ہوئی تو وہ گویا ہوئے۔ میاں کاریگر آدمی ہو، رندہ خوب لگاتے ہو، پس چولیں بٹھانے میں ذرا چُوک رہے ہو، ذرا قریب آؤ تو کچھ کہوں۔ وہ سرک کر بڑے میاں کے اور قریب ہو گیا۔ میاں جی نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور بولے، جاؤ میاں، اب راہ پکڑو، ذرا کچی پکی کا دھیان کرنا، باقی سب بھلی ہے۔

رات پچھلے پہر، گئے دنوں کے معمول کے مطابق وہ کاغذ قلم لیے بیٹھا تھا اور چاہتا تھا کہ کچھ لکھے، لکھے وہ کچھ کہ جو وہ لکھنا چاہتا ہے مگر سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ کہانی اس نے شروع کی اور کچھ ہی دیر بعد لکھ بھی دی لیکن غبار اُترا نہیں تھا۔ کچھ اور ابھی تھا کہ جو اس نے لکھنا تھا۔ ذرا دیر کو مضطرب ہوا لیکن پھر کچھ سوچ کاغذ تہہ کیے اور اطمینان سے بستر پر دراز ہو رہا۔ آج جو لکھنا تھا وہ لکھ دیا۔ کل کی کل آئی تو دیکھیں گے۔ شاخوں پر بور آتے آتے آتا ہے، پھر پھول کھلتے ہیں، پھر پھل لگتے ہیں، میوے ہوتے کسی کے ہیں، لے کوئی اور اُڑتا

ہے۔ دائرے گھوم رہے ہیں، سو گھوم رہو۔ گھات لگا کر بیٹھا کون۔ آج کچھ ہے کل کچھ......
آنکھوں میں خمار اتر رہا تھا۔ قریب ہی کہیں بڑے میاں کی مسکراہٹ ابھری۔ اُس نے اپنے
آپ کو ٹہوکا، مسکرایا اور چپکے چپکے نیند وادیوں میں اترتا چلا گیا۔

دھند مسافت

ارادہ باندھنے والے نے ارادہ باندھا، خوب سوچ بچار کی، ہر ہر پہلو پر گھنٹوں سر مارا، ایک خاکہ سا ترتیب دیا اور پھر ذہن میں واضح ہوتی لکیروں کو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ کل سے اس کے مطابق کام ہوگا۔ ہاں کل سے ضرور ایسا ہوگا۔ اس نے سوچا، کاغذ لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

باہر رات کافی ڈھل چکی تھی۔ ہوا کے سرد جھونکے بند کھڑکی سے ٹکرا کر ہلکی ہلکی تھپک پیدا کر رہے تھے اور شاید بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ خدا کرے کل تک موسم صاف ہو جائے اور ایسا صاف ہو کہ طبیعت خوش ہو جائے۔ اس نے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن کے پردوں پر لائنیں سی چل رہی تھیں...... لائنیں جو کچھ دیر پہلے وہ کاغذ پر منتقل کر چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ سو جائے مگر نہ سو سکا۔ اندر ہی اندر ایک فلم سی چلنے لگی۔ پل بہ پل بدلتی تصویروں کا ایک سلسلہ کہ آنکھیں بند ہونے کے باوجود اس کی نظر میں تھا۔ لرزتے مناظر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے رہے اور وہ مسلسل سونے کی کوشش کے باوجود جاگتا رہا۔

وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا...... سوچتا رہا آنے والے کل کے بارے میں اور سوچتا رہا گزرے ہوئے کل کے بارے میں، مگر سب کچھ الجھ سا گیا تھا، ترتیب الٹ پلٹ سی ہو گئی تھی اور وہ بھول بھلیوں میں گھومے چلا گیا۔ چکر پہ چکر، مسلسل چکر کہ گویا وہ کسی بڑے سے

گول ڈبے میں بند ہے اور ڈبہ لڑھک رہا ہے۔ مسلسل بل کھاتی لہروں میں اس نے چاہا کہ جھانک کر دیکھے...... جھانک کر دیکھے کہ بھلا اس گھماؤ کے اس پار کیا ہے مگر بے سود...... کچھ دکھائی نہ دیا۔ تھا تو بہت کچھ اور محسوس بھی ہو رہا تھا مگر دکھائی نہ دیتا تھا...... دکھائی نہ دیتا تھا کہ دیکھنے کے لیے پل بھر کو رکنا ضروری ہوتا ہے۔ اور رک رک کر، پلٹ پلٹ کر، بار بار دیکھنا ہی اصل دیکھنا ہے۔ ایسا نہیں تو دیکھنا نہ دیکھنا برابر۔ سو وہ محسوس کیے جانے کے باوجود کچھ بھی نہ دیکھ پا رہا تھا۔

گھماؤ میں وہ کچھ بھی تو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ بس لہریں ہی لہریں تھیں، نقطے ہی نقطے اور لکیریں ہی لکیریں۔ آنے والے کل کی لکیریں، گزرے ہوئے کل اور اس سے پہلے و بعد کے بہت سے کل...... کہ جن کے سارے منظر مسلسل بل کھاتی لکیروں میں ڈھل رہے تھے۔ جلتی بجھتی تڑ مڑ ہوتی لکیریں...... نقطے اور لائنیں...... کون دیکھے، کون جانے، کون بُوجھے، کہ جاننے اور بوجھنے کا کوئی تعلق نہ تو دیکھنے سے ہے نہ سوچنے سے۔ یہ دانہ تو آپ ہی آپ بنتا ہے، آپ ہی آپ اُگتا ہے اور جب جوان ہو کر لہلہانے لگتا ہے تو آپ ہی آپ کٹ جاتا ہے۔ کتنے ہی رک رک کر، پلٹ پلٹ کر، بار بار دیکھنے والے دیکھے کہ کچھ نہیں بوجھتے اور کیا ہی کمال کے سوچنے والے اور سوچ سوچ کر آدھے رہ جانے والے دیکھے کہ کچھ نہیں جان پاتے۔ بس چلتی ہوئی لائنیں اور لکیریں ہی ہیں کہ سب کچھ ہیں، کسی پر آپ ہی آپ کھل جائیں تو کھل جائیں۔ نہ کھلیں تو کیا دیکھنا اور کیا سوچنا۔ سو اس نے سوچنا بند کیا اور دیکھے تو وہ پہلے ہی نہیں رہا تھا۔

بند ڈبے میں وہ مسلسل لڑھکے جاتا تھا اور اپنے تئیں اس نے سوچنا اور دیکھنا ترک کر دیا تھا لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ سب کچھ ترک کر سکتا ہے مگر سوچ پر پہرے بٹھانا اس کے بس میں نہیں۔ وہ نہیں سوچے گا تو مر جائے گا۔ پس سوچنا ضروری ہے کہ زندگی کی ڈور اسی سے بندھی پڑی ہے۔ سو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوچنے لگا۔ سوچتا رہا آنے والے

کل کے بارے میں اور سوچتا رہا گزرے ہوئے کل کے بارے میں۔ چپ چاپ آنکھیں بند کیے سوتا جاگتا کروٹیں بدلتا سوچتا رہا......اور سوچتے سوچتے رات گزر گئی۔

صبح ہوئی تو کیا دیکھتا کہ وہ کاغذ جس پر رات اس نے لائنیں کھینچی تھیں بالکل کورا پڑا ہے۔ کہیں کوئی لائن نہیں، کوئی نقطہ تک بھی نہیں۔ یہ آج ہی کی بات نہ تھی ایک مدت سے یہی ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر کاغذ پر الٹی سیدھی لائنیں کھینچتا رہتا۔ خوب غور وخوض کے بعد انہیں درست کرتا۔ درست کرتا اور ارادہ باندھتا کہ کل ضرور اس کے مطابق کام ہوگا، مگر عجب تھا کہ صبح اٹھتا تو سب لائنیں غائب ہوتیں اور کاغذ کورے کا کورا۔ ارادوں کا محل دھڑام سے نیچے آ رہتا اور کچھ بھی نہ بن پڑتا۔ سارا منصوبہ تو ان لائنوں کے اندر تھا...... لائنیں کہ جو رات بھر جھلملاتیں اور صبح دم بجھ جاتیں۔ مگر وہ مایوس نہ ہوتا کہ اس کے نزدیک مایوسی ابھرتی ہوئی، اپنا آپ کھولتی ہوئی لائنوں کو کھا جاتی ہے۔ سو اس نے ارادہ باندھا اگلی رات کا اور باہر کو چل دیا۔

باہر گلی میں کیچڑ ہی کیچڑ تھا۔ رات ہلکی ہلکی بارش نے کچی مٹی کو دلدل بنا دیا تھا۔ یہ بھی شکر کہ تیز نہیں ہوئی، چھت ٹپکنے لگتی تو کیا ہوتا۔ مالک مکان کو بیسیوں دفعہ وہ کہہ چکا تھا کہ چھت پر پلاسٹک شیٹ ڈلوا دے، کم از کم پانی تو اندر نہ آئے۔ مگر وہ تو اونچے دماغ کا آدمی تھا، ہر بار یہی کہتا میاں منظوری ہو لینے دو پھر دیکھنا اس کچی بستی کو کیا بھاگ لگتے ہیں، پلازے بنیں گے پلازے۔ پھر ایک پکا کمرہ تم لے لینا مگر ہاں یاد رکھیو کرایہ بیس روپے نہ ہووے گا بیس سو روپے ہووے گا۔ سالا کتا...... اس نے مالک مکان کو کوسا اور کیچڑ بھری گلیوں سے ہوتا پکی سڑک پر آ گیا۔ بچے اسکول جا رہے تھے اور ملازم اپنی ملازمتوں پر، ہر طرف چہل پہل تھی۔ وہ ٹہلتا ہوا ایک طرف کو ہو لیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا چلتا گیا۔ اسے کوئی جلدی نہ تھی کہ نہ تو اس کے بچے تھے اور نہ وہ کسی کا ملازم۔ بچوں کے لیے اس ملک میں شادی کرنا شرط ہے اور ملازمت کے لیے تعلیم...... یہ دونوں چیزیں اس کے پاس نہ

تھیں۔ سو وہ چلتا گیا اور حسبِ معمول شہر کی پُر شور سڑکوں اور پُر ہجوم بازاروں میں پھرتا پھراتا رہا۔ رک رک کر، پلٹ پلٹ کر، بار بار دیکھنا اس کی عادت نہ تھی سو بہت کچھ دیکھنے کے باوجود وہ کچھ نہ دیکھتا تھا اور پل بہ پل بہت کچھ سوچنے کے باوجود وہ کچھ نہ سوچتا تھا۔ بس چلتی پھرتی جھلمل کرتی لائنوں میں وہ بھی ایک لائن کی طرح حرکت کرتا، اس امید پر کہ شاید کبھی یہ لائنیں آپ ہی آپ کھل جائیں گی اور کورا کاغذ کہ جو باوجود کوشش کے کورے کا کورا رہ جاتا ہے...... بولتی ہوئی، اپنا آپ کھولتی ہوئی لائنوں اور لکیروں سے سج جائے گا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا چلتا جاتا تھا کہ ایک زرق برق کپڑوں میں ملبوس لائن خوشبوئیں اڑاتی اس کے سامنے سے لہراتی ہوئی گزر گئی۔ وہ ٹھٹک گیا اور پل بھر کو رک کر پھر سے چل دیا۔ کاش لائنیں ایک دوسرے سے ٹکرا جایا کریں۔ لائنوں کا آپس میں ٹکرا جانا ہی بہتر ہے۔ نہ ٹکرائیں تو آپ ہی آپ ابھر کر آپ ہی آپ گم ہو جاتی ہیں۔ ٹکرا جائیں، گتھم گتھا ہو جائیں، ایک الجھا ہوا گچھا بن جائیں تو گم ہو کر بھی گم نہیں ہوتیں۔ سلیقے سے الجھیں تو اور بھی بہتر۔ کہ اس طرح کا الجھنا اصل میں الجھنا نہیں، سلجھنا ہے۔ بے سلیقہ لائنوں کا گم ہو جانا ہی اچھا...... گم ہو جانا ہی اچھا۔ وہ اپنے آپ کو دوسری لائنوں میں الجھنے سے بچاتا گھومے چلا گیا اور جب قدم بوجھل ہونے لگے تو کچی بستی کی کیچڑ بھری گلیاں سامنے تھیں۔ گھر پہنچ کر وہ صحن میں چارپائی بچھا کے بیٹھ گیا۔ ابھی رات ہونے میں کافی دیر تھی۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا مگر ابھی اس نے گم ہونے سے پیشتر کافی چلنا تھا۔ دوسری لائنوں میں اپنے آپ کو الجھنے سے بچا کر چلنا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے! یہ تو کوئی سورج سے پوچھے۔

......سورج ہی سے کیوں! چاند بھی تو ایسا ہی کرتا ہے، ستارے بھی تو یہی کچھ کرتے ہیں۔ مگر میں...... میں کوئی ستارہ تھوڑی ہوں، میں سورج بھی نہیں اور چاند بھی نہیں...... میں تو میں ہوں۔ مجھے تو الجھنا ہے، بار بار مڑنا ہے، مڑ مڑ کے گم ہونا اور گم ہو ہو کے ابھرنا ہے،

چاہے سلیقے سے الجھوں یا بد سلیقگی سے۔ الجھنا ضروری ہے، کہ لائنوں اور لکیروں کی زندگی اسی میں ہے۔ ایک دوسری سے ٹکراتی رہیں، رگڑ پہ رگڑ کھاتی رہیں تو آپ ہی آپ کھل بھی جاتی ہیں۔ مگر میں کس سے الجھوں اور کیونکر الجھوں کہ مدتوں سیدھا چلتے چلتے اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔ پہلے اذیت تھی، اب راحت ہے۔ اب کے مڑنا اذیت ہے لیکن مجھے مڑنا ہے، الجھنا ہے، اس سے پہلے کہ میں گم ہو جاؤں۔ سو اس نے ارادہ کیا۔ اندر کی لائنوں کو آپس میں گڈ مڈ ہونے دیا اور رات کا انتظار کرنے لگا۔

رات ہوئی تو اس نے کاغذ قلم سنبھالا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہا۔ خوب سوچ بچار کی، ہر ہر پہلو پر گھنٹوں سر مارا، ایک خاکہ سا ترتیب دیا اور پھر ذہن میں واضح ہوتی لکیروں کو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ کل سے اس کے مطابق کام ہوگا۔ ہاں کل سے ضرور ایسا ہوگا۔ اس نے سوچا، کاغذ لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ رات بھر سوتا جاگتا کروٹیں بدلتا رہا، گول ڈبے میں بند مسلسل لڑھکتا رہا اور مسلسل لائنوں، لکیروں اور نقطوں کے جال بگڑ بگڑ کر بنتے اور بن بن کر بگڑتے رہے۔ صبح ہوئی تو اس نے آنکھ کھولی، جھپٹ کر کاغذ اٹھایا، کیا دیکھتا ہے کہ کاغذ حسبِ معمول کورے کا کورا ہے، کوئی لائن، کوئی لکیر، کوئی نقطہ تک نہ تھا۔ ارادوں کا محل چکنا چور ہوا مگر ہمیشہ کی طرح وہ مطمئن تھا...... شاید مدتوں سیدھی چلتی لائن کا مڑنا کاغذ کو بھی گوارا نہ تھا۔ شاید لکیروں اور لائنوں کے کھلنے اور نہ کھلنے کا کوئی تعلق نہ تو مڑنے سے ہے نہ الجھنے سے اور نہ سیدھا چلنے سے۔ کچھ تو ایسی ہوتی ہیں کہ الجھ الجھ کر، مڑ مڑ کر، رگڑیں کھا کھا کے بھی نہیں کھلتیں اور کچھ ایسی کہ بن الجھے، بن مڑے آپ ہی آپ کھل جاتی ہیں۔

دیمک زدہ کھنڈر آس

اُداسی پھن پھیلائے چاروں اور گھوم رہی ہے۔ گہرے سناٹوں میں پھنکارتی پژمردہ چاپ، لرزتے سائے اور مسلسل مدھم ہوتے کچھ بوسیدہ نقش۔ دروازے بند ہیں، بالکل بند، اور اندر شاید کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔ باہر گلی بھی سنسان ہے اور بارش ایسی تیز کہ گویا آج سب کچھ بہا لے جائے گی۔ دور نکڑ پر کوئی چراغ سا ٹمٹما رہا ہے۔ یخ ٹھنڈی طوفانی رات میں اِدھر کون آئے گا۔ کھنڈر یادوں کے ویرانے تو بہار موسموں میں بھی آباد نہیں ہو پاتے، اس موسم میں ادھر کون آئے گا۔ دور، حدِ نظر کے دوری پر جھلملاتی روشنیوں والی بستی آباد ہے۔ ہر طرف ہلچل، ہر طرف لبالب بھری زندگی، چھلکتے پیانوں کے دوش پر رقصاں نقرئی کھنکھناہٹیں۔ زندگی تو اُدھر کہیں، کسی نشیلی ترنگ کی بانہوں میں بانہیں ڈالے تھرک رہی ہے، اِدھر کون آئے گا۔ کھنڈر میں کچھ سائے لرزاں ہیں، کچھ بوسیدہ نقش اور کوئی پھنکارتی ہوئی پژمردہ چاپ۔ اداسی اندھیروں کے ساتھ قدم قدم رینگتی در و دیوار میں گھسی چلی جا رہی ہے اور میں...... اور میں کہ جو انہی دیواروں کے بیچوں بیچ کہیں دفن ہوں، دیمک زدہ آنکھوں میں گلاب سجائے دور گلی کے نکڑ پر ٹمٹماتے چراغ کو تکے چلا جا رہا ہوں۔ شاید کوئی چلا آئے۔ کوئی نقرئی کھنکھناہٹ، کوئی نشیلی ترنگ......لبالب بھری زندگی۔ مدتیں ہوئی اُسے گئے ہوئے۔ کاش وہ لوٹ آئے۔

کاش وہ لوٹ آئے کہ جو برسوں برس میرے اندر ہی اندر کہیں گنگناتا رہا۔ قریب ہو ہوا نت گرمیلے شوخ ہونٹوں کا جادو جگاتا اور سب سے بڑھ کر اس کی خماری آنکھیں اور مخملیں ہاتھوں کا لمس...... آہ! وہ لمس کہ جو رواں رواں میں سچے موتیوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ کچھ ٹھیک سے تو یاد نہیں کہ کب وہ خوشبو بن کر میری دھڑکنوں میں اترا اور پھر اترتا ہی چلا گیا لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ بچپنے کے کوئی معصوم دن تھے۔ جن کے درمیان میں رہتا تھا وہ روز روز لڑتے، ایک دوسرے پر غراتے ہوئے جھپٹتے اور اکثر جھگڑا بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی تک جا پہنچتا۔ میرا ننھا سا دل کانپ کانپ اٹھتا۔ مگر میری تر بتر آنکھوں کو بھلا کون دیکھتا۔ سو میں اٹھتا اور ہچکیاں لیتا بڑے کمرے کے ساتھ بنی چھوٹی سی اندھیری کوٹھڑی میں جا دبکتا۔ یہاں ایک طرف کپڑوں، رضائیوں اور برتنوں کا انبار تھا اور دوسری طرف اوپر تلے رکھی تین چار کھٹولا نما چارپائیاں۔ میں ٹیڑھا میڑھا ہو کھٹولوں کے نیچے کچے فرش پر کنڈلی مار بیٹھ رہتا۔ ایک چھوٹی سی قبر...... اندھیرا...... تنہائی اور معصوم سوچوں کے بھنور بیلے۔ یہ لوگ مجھے کھیلنے بھی نہیں دیتے۔ باہر بھی نہیں جانے دیتے۔ کھلونے بھی نہیں ہیں۔ میں کیا کروں۔ پتہ نہیں یہ لڑتے کیوں ہیں۔ میں ان سے اب نہیں بولوں گا۔ بالکل نہیں۔ کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔ غصہ آنسو اور عجیب و غریب منصوبے۔ ننھے ہاتھوں سے میں اپنے اوپر تنی چارپائی کی رسیوں سے کھیلتا رہتا اور پھر یوں ہی بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گزر جاتے۔ بچپنے کی اسی خود ساختہ قبر میں شاید ایک دن وہ اترا تھا۔ تمتمائے ہوئے ماتھے پر اپنا کافوری ہاتھ رکھ کر دھیمی مسکراہٹوں کے ساتھ اس نے مجھے پچکارا۔ میرے مخمل ایسے گالوں کو سہلایا اور اپنی ریشمی بانہوں میں بھر کر قریب تر کر لیا۔ پیار بھرے لمس میں طمانیت ہی طمانیت تھی۔ سکون ہی سکون۔ ایک لذت، ایک ٹھہراؤ ایک عجیب و غریب ارفعیت۔

برسوں وہ اس قبر میں میرے پہلو بہ پہلو رہا۔ پہلے پہل میں ڈر کر، وحشت زدہ ہو کر اور باہر والوں کے غراتے چہروں سے بھاگ کر یہاں آ چھپتا تھا لیکن اب اُس کے لیے،

صرف اُس کے لیے میں اِدھر آتا اور پھر ہم پہروں بیٹھے سرگوشیاں کرتے رہتے۔ وہ مجھے اچھی اچھی کہانیاں سناتا۔ پیار بھرے مدھر گیت اور کان میں رس بن کر اترتی لوریاں۔ اس کی نرمیلی گود...... آہ! اس کی نرمیلی گود کہ جس میں سکون ہی سکون تھا۔ چار پائیوں کے انبار تلے گھپ اندھیروں میں اب بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ ڈر تو باہر تھا۔ باہر کہ جہاں روشنی نے چہروں کو پہچان دے دی تھی۔ خونخوار چہرے، غراتے ہوئے ایک دوسرے پر پل پڑنے کو بے قرار۔ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہوتے ہوئے۔ اندر اندھیرا تھا، تنہائی تھی، سناٹا تھا اور پہلے پہل یہاں ڈر بھی کہیں زیادہ۔ لیکن جب وہ اترا تو پھر سکون ہی سکون تھا۔ طمانیت ہی طمانیت، ایک ایک ٹھہراؤ۔ ایک عجیب وغریب لذت۔

تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ انہوں نے وہ مکان ڈھا دیا۔ اندھیری کوٹھڑی بھی بنیادوں تک اکھڑ گئی۔ اب پکی اینٹوں سے کچھ نیا بنایا جا رہا تھا۔ سہم کر اندھیری قبر میں اتر جانا مفقود ہو گیا۔ اب کہاں جاؤں۔ ہفتوں بے چین رہا۔ ہجوم میں طبیعت متلا سی جاتی۔ گلی کی سمت ایک بیٹھک نما کمرہ تھا اور اس کے اوپر چوبارہ۔ یہ انہوں نے نہیں ڈھایا۔ بیٹھک میں وہ سب رہتے اور چوبارے میں کاٹھ کباڑ۔ اب جب بھی وہ غراتے تو میں آنکھ بچا کر چوبارے میں آ گھستا۔ پہلے پہل یہاں آتے ہوئے وحشت سی ہوئی۔ گرد وغبار اور پرانی چیزوں سے اٹھتی بساند میں اندھیری کوٹھڑی کی یاد رہ رہ ستاتی لیکن اب وہاں تو کچھ نیا بن رہا تھا۔ یادیں ملبے میں دبتی چلی جا رہی تھیں۔ پتہ نہیں پرانا مکان کیوں ڈھا دیا گیا۔ بس کسی کو اتنا کہتے سنا کہ آس پاس کے سبھی گھر نئے بن گئے ہیں ہمارا گھر بھی نیا ہونا چاہیے۔ اس پر بھی وہ خوب خوب لڑے۔ لمبی لمبی تُو تکار۔ آخر نئے خیال والے غالب آئے اور پرانا مکان اکھاڑ ڈالا گیا۔ چوبارے میں میرا دل لگتے ہفتوں گزر گئے۔ یہاں اندھیرا کم تھا اور گہرا سناٹا بھی۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ چار پائیوں کے نیچے کنڈلی مارے بے تابانہ انتظار۔ ہفتوں بعد کہیں سے وہ آ اترا اور پھر گویا سب کچھ جوں کا توں۔ پیار بھرے لمس میں طمانیت ہی

طمانیت تھی۔ چوبارے کی بوسیدہ دیواروں کے بیچ، چارپائیوں تلے کچی قبر میں، وہ اور میں پہلو بہ پہلو، خوشبوؤں بھری نرمیلی سنگت میں ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔

بچپن گزر گیا۔ لڑکپن کی چادر پھیلی اور سمٹ گئی۔ جوانی آئی اور چار پہر اپنی درانتی چلا روانہ ہوگئی۔ وہ ساتھ ساتھ رہا۔ میرے رنگ بدلتے قالبوں میں اپنا آپ گھول گھول کچھ کا کچھ ہوتا رہا۔ ہجوم کے بیچوں بیچ جب طبیعت متلانے لگتی اور اکلاپے کا انجانا شکنجہ مجھے بھنبھوڑنے لگتا تو کسی اندھیرے گوشے میں، کسی انت سناٹے میں اپنا آپ سمیٹ میں اسے پکارنے لگتا۔ اندھیری کوٹھڑی نہ رہی۔ چوبارہ بھی چھن گیا، اس کے بعد بیسویں قبریں بنیں، چھن گئیں۔ مگر اب قبروں کے چھن جانے کا غم نہ رہا کہ آہستہ آہستہ ایک چھوٹی سی قبر میرے اندر ہی اندر کہیں سے آ اتری تھی۔ جب جب جی متلانے لگتا، میں چپ چاپ اس قبر کے دھانے پر آ کھڑا ہوتا اور پھر قبر مجھے اپنے اندر سمیٹ سمیٹ لیتی۔ گھپ اندھیروں میں کنڈلی مارے میں گھنٹوں بیٹھا اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا۔ اکثر وہ بھی قریب آ جاتا اور اپنے کافوری ہاتھ میرے پراگندہ بالوں میں ڈال سہلاتا رہتا۔ کبھی اپنی خوشبوؤں بھری گود میں مجھے سمیٹ تھپکیاں دیتا، کبھی میٹھے سریلے گیتوں سے اپنی محبتوں کا رس ٹپکانے لگتا اور کبھی زعفرانی بوسوں کا ایک نہ تھمنے والا تسلسل۔ زندگی لبالب بھر جاتی۔ آہ! لبالب بھر جاتی۔

برسوں کی رفاقت اور قرب و محبت کے باوجود میں اس کا نام تک بھی نہ جان پایا۔ کہ نام تو بقول اس کے چیزوں کی ہیئت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اور اس کی شاید کوئی ہیئت تھی ہی نہیں۔ ایک احساس، ایک مجرد لمس یا ایک بے شباہت ہیولا۔ اندھیروں میں شباہتیں مٹ مٹ جاتی ہیں۔ اندھی قبروں میں ہیولے رہ جاتے ہیں یا کوئی احساس اور وہ بھی اس حد تک کہ آواز اور لمس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جوانی کے دنوں میں کہ جب تجسیم کا جوبن میرے رُواں رُواں میں امڈ آیا تھا، میں نے اسے بھی مجسم دیکھنے کی آرزو کی۔ سو وہ مجھے مجسم ہو ملا۔ ہر روز ایک نیا قالب۔ ایک سے ایک پری چہروں کا ہجوم اور میں۔ نقرئی

کھنکھناہٹوں اور نشیلی ترنگوں کے پہلو بہ پہلو انگڑائیاں بھرتی جوانی۔ شباہتیں بہت جلد اکتا دیتی ہیں۔ وجود کی بے قراری بس دوسرے وجود سے مس ہونے تک۔ اِدھر ہونٹوں کی تپش نے تپش کو چھوا، انگاروں نے انگاروں سے رگڑ کھائی، رس ٹپکا اور بس۔ سو وہ قالب پہ قالب بدلتا رہا اور میں اس کے پیچھے پیچھے یوں کہ جیسے کسی نے تختے سے باندھ دریا لہروں پر دھکیل دیا ہو۔

وقت کے مہندی لگے ہاتھوں میں سفیدی اتری تو اس کا وجود بھی رفتہ رفتہ گم ہونے لگا۔ دھندلاہٹ مسلسل بڑھ رہی تھی۔ شوخ و شنگ شباہت میں جگہ جگہ جھریوں نے دراڑیں کھینچ ڈالیں اور رعشہ چپکے چپکے نرمیلی گرماہٹوں کو نگلنے لگا۔ میرے وجود میں بھی ایک مدت سے سرسراتے سانپوں نے کنڈلی ماری اور اندر ہی اندر کہیں معدوم ہوتے چلے گئے۔ خنکی نے وجود کے ادھ کھلے کواڑوں پر دستک دی اور پھر چپ چاپ چاروں اور گھوم اپنی چادر پھیلا دی۔ باہم مل بیٹھنے کے اوقات مختصر ہوتے گئے اور آخر آخر محض چند ثانیوں کی رفاقت اور پھر ایک طول طویل بے رحم تنہائی۔ اندھیرے پوری تندی کے ساتھ گرداگرد سمٹ رہے تھے۔ کبھی کبھار پل دو پل کو وہ اترتا تو خوف کے تنگ ہوتے دائرے تڑخ تڑخ جاتے۔ اندر ہی اندر بنی قبر میں اس کی موجودگی طمانیت کا ایک عجیب و غریب نور سا پھیلا دیتی۔ ایک ٹھہراؤ۔ ایک لذت، ایک میٹھا میٹھا سا احساس۔ شاید امید کی ایک کرن یا سنہرے خوابوں کا ایک موہوم پرتو۔ وقت کی روانی میں ہم دونوں گم ہوتے جا رہے تھے۔ اندھیروں کا بے رحم گھماؤ تیز تر۔ تیز اور تیز۔

وہ جو لڑتے تھے۔ ایک دوسرے پر پل پڑتے اور ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے تھے، مدت ہوئی گم ہو گئے۔ جوان رتوں میں میرے ہمراہ پہلو ملا ملا چلنے والے بھی کھو گئے۔ انجانے ہجوم اور بانہوں میں بانہیں ڈال تھرکنے والے بھی نہ رہے۔ لبالب بھری زندگی تنکا تنکا بکھر گئی۔ اندھیری کوٹھڑی اور چوبارے میں سے نکل وہ چھوٹی سی قبر کہ جس نے

پل بہ پل سینکڑوں رنگ بدلے، اب اندر ہی اندر کہیں کھب سی گئی ہے۔ میرے سہمے ہوئے وجود پر اپنا کافوری ہاتھ دھرنے والا اور زعفرانی بوسوں سے امید کی پازیبیں چھنکانے والا بھی نہ رہا۔ مدت ہوئی اسے گئے ہوئے۔ اب تنہائی کی کرخت دیواروں کے بیچوں بیچ میں دفن ہو رہا ہوں...... مسلسل دفن ہو رہا ہوں۔ اداسی پھن پھیلائے چاروں اور گھوم رہی ہے۔ گہرے سناٹوں میں پھنکارتی ہوئی پژمردہ چاپ، لرزتے سائے اور مسلسل مدھم ہوتے کچھ بوسیدہ نقش......کھنڈر آنکھوں میں گلاب سجائے، دور گلی کے نکڑ پر ٹمٹماتے چراغ کو میں تکے چلا جا رہا ہوں۔ شاید کوئی چلا آئے۔ کوئی نقرئی کھنکھناہٹ، کوئی نشیلی ترنگ...... لبالب بھری زندگی۔ یخ ٹھنڈی طوفانی رات گھمبیر تر ہو رہی ہے۔ اس موسم میں اِدھر کون آئے گا...... شاید کوئی بھی نہیں...... آہ! کوئی بھی نہیں۔

تھک کر گرتے شوخ پرندے

وہ یقیناً تھک چکی تھی لیکن اس کی گلاب آنکھوں میں شوخ جھلملاہٹیں ویسی کی ویسی تھیں جیسے برسوں پہلے۔ باریک بھنوؤں کی تنی کمانوں کے نیچے کنول پلکوں کے گھنیرے سائے اور سرخ تمتمائے ہوئے گالوں پر لپکتے لہریے مسلسل رواں دواں تھے۔ عنابی ہونٹوں سے رس نچڑ نچڑ جاتا تھا اور پھرتیلے بدن کے ایک ایک خم سے آج بھی انگارے سے ابھرتے محسوس ہوتے تھے۔ لیکن دیکھنے والی گھاگ نگاہوں نے جان لیا کہ سورج اب بجھا ہی چاہتا ہے۔ ہر سال وہ ادھر سے گزرتی تھی۔ چند دن ہمارے ہاں قیام کرتی اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتی۔ برف وادیوں میں کہ جہاں سال کے آٹھ مہینے زندگی نقطۂ انجماد تلے دبی رہتی ہے، اس کا گھر تھا۔ برس ہا برس سے معمول یہی تھا کہ جب تند برفیلی ہوائیں غراتی ہوئی سرسبز پہاڑوں پر ٹوٹ پڑتیں اور ہر طرف سفید ٹھنڈے انگاروں کی چادر بچھنے لگتی تو وہ اپنا ساز و سامان سمیٹ گرمیلے میدانوں کو روانہ ہوتی۔ میلوں میل ڈھلوانیں اترتی طے شدہ راستوں پر گھوم گھوم وہ میرے گھر، کہ جو اس کی انتہاؤں کے عین درمیان واقع تھا، آوارد ہوتی۔ چند دن کے لیے در و دیوار گویا کہ چھکنے لگتے۔ پھر وہ اپنی منزل کو روانہ ہو جاتی۔ مہینوں بعد واپسی کے سفر میں بھی یہ عمل دوہراتی اور آخر پہاڑ دیوتا اسے اپنی طرف کھینچ لیتے۔

یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اس حسن مجسمے کی میز بانی کا شرف ہمارے حصے میں آیا۔نہیں معلوم کہ یہ اتفاقات کا سلسلہ کیا ہے لیکن زندگی کے اندھیارے سفر میں یہ انجانی کرنیں اپنا وجود منواتی ہی رہتی ہیں۔تو ہُوا یوں تھا کہ اترتی سردیوں کی ایک افسردہ شام جب میں اور ماں جی گھر کے برآمدہ نما کمرے میں انگیٹھی سلگائے بیٹھے تھے، باہر ایک گاڑی آ کر رُکی۔ ہمارے گھر کے اردگرد چار دیواری نہیں۔بس ایک کھلے احاطے میں بنے دو کمرے، ایک برآمدہ اور رسوئی (کچن)۔چاروں طرف وسیع صحن اور اس کے اردگرد سرکنڈوں کی پست سی باڑ۔صحن میں ماں جی نے قسم قسم کی سبزیاں اُگا رکھی ہیں۔دن کے وقت میں اپنی دوکان پر کہ جو گھر سے ذرا ہی فاصلے پر قصبے کے عین درمیان ہے، کام میں مصروف رہتا اور ماں جی اپنے اکیلے پن کو ان سبز سبز کیاریوں کی تراش خراش میں صرف کرتیں۔شام کو میں واپس آ جاتا اور اس برآمدہ نما کمرے میں کہ جو کچن بھی تھا، بیٹھک بھی اور ٹی وی لاؤنج بھی، ہم دونوں ماں بیٹا بیٹھ رہتے۔کھانے کے بعد گھنٹوں بیٹھے حقہ گڑگڑاتے اور سامنے موجود سبزیلی کیاریوں کی ایک طرح سے نگرانی بھی کہ کوئی بھولا بچھڑا جانور نہ کہیں سے گھس آئے۔اصل میں چراگاہ کی طرف جاتا رستہ بھی قریب تھا اور پختہ سڑک بھی۔قصبے کے باقی گھر ہم سے ذرا فاصلے پر تھے۔ابا جی کو خدا جنت نصیب کرے یہ جگہ پسند تھی۔کھلی کھلی کشادہ فضا اور نسبتاً اونچی جگہ ہونے کی وجہ سے دور تک پھیلے میدانوں کا خوبصورت نظارہ۔شمال میں افق کی آخری لکیروں کے آس پاس مہیب پہاڑوں کی کوہانیں قطار اندر قطار دکھائی دیتیں۔باقی تین اطراف اونچے نیچے میدان۔مغرب میں ذرا جنوب کی طرف سرکا ہوا حدِ نظر کی دوریوں پر ایک بڑا اور اکیلا پہاڑ کہ جس کے پیچھے سردیوں میں سورج روپوش ہوتا، ہمارے گھر سے صاف نظر آتا تھا۔تو ہم نے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے ہی دیکھا کہ رکنے والی گاڑی سے وہ اتری اور بونٹ کھول کر کچھ دیکھا بھالا۔پھر دوبارہ سے اندر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا مگر ذرا دیر کو خرخراہٹ اٹھتی اور پھر بند۔مسلسل کوشش کے باوجود بھی گاڑی سٹارٹ نہ ہوئی۔سڑک

سنسان تھی اور قریب ترین سہارا، ہمارا گھر۔ ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا تھا اور ہم نے مقدور بھر کیا بھی لیکن شاید آج رات اس کا ہمارے گھر رہنا، ماں جی کی شفقتوں سے متاثر ہونا اور پھر برس ہا برس یہاں لوٹ لوٹ آنا لکھا تھا۔ سو ایسا ہی ہوا۔

وہ رات بھی کیا عجب تھی۔ ماں جی کو اتنا خوش میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا۔ بیٹی کے لیے ترسی ہوئی ممتا نے اسے چوم چوم لیا۔ کھانا تیار تھا اور شاید کوئی سبزی پکی تھی لیکن ماں جی نے فوراً مرغی ذبح کرنے کا حکم دیا۔ آن کی آن میں دیگچی چڑھ گئی اور پھر بھنتے مسالوں کی خوشبو سُو نے آنگن میں پکار پکار پھرنے لگی کہ آج بوڑھے ہاتھوں میں کوئی جادو اتر آیا ہے۔ میں بھاگم بھاگ اپنی دوکان پر گیا اور عمدہ عمدہ میووں سے لفافے بھر لایا۔ پائی پائی نفع نقصان کا حساب رکھنے والے ذہن نے بھی آج شاہ خرچی میں گویا حاتم طائی کی قبر پر لات دے ماری۔ اس کی گاڑی کو دھکا لگا کر ہم اپنے صحن میں لے آئے۔ کھانے کے دوران اس نے بتایا کہ برفیلے پہاڑوں کے اس پار اس کا گھر ہے۔ مدت ہوئی والدین اگلے جہانوں سدھار گئے۔ اب وہ اکیلی ہے اور جائیداد بے انت۔ والد کا ایک عزیز دوست سب مال اموال کی نگرانی کرتا ہے اور وہ نازوں پلی اب اس شخص کی مہربانی سے پھول گلابوں جیتی ہے۔ ادھر اترائیوں کے اس پار گرمیلے میدانوں میں بھی اس کا اپنا گھر ہے۔ جہاں سردیوں میں وہ چلی آتی ہے اور گرمیوں میں جب برف پگھل پگھل اپنا سونا دریاؤں میں بہا دیتی ہے تو تب واپسی کا سفر آغاز ہو جاتا ہے۔ کھانے کے بعد میں تو جلدی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا لیکن ماں جی اور وہ دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ خلافِ معمول مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کان آوازوں پر لگے تھے اور آنکھوں میں اس کا سراپا نقش تھا۔ نہ جانے خدا نے اسے چاندی سونے سے گوندھ گوندھ بنایا تھا یا کہیں کسی اور دنیا سے دودھیا مٹی میں سینکڑوں ہزاروں چمکیلے رنگ ڈال ڈال نکھارا تھا کہ پہلی ہی نظر میں آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ ایسا مرقع جمال نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ چمبیلی کے پھول پر گویا کسی نے ہزار سمتوں سے نور کرنیں

ڈال دی ہوں۔ سیاہ گھنیرے بال کہ جب جب ذرا جھٹکا دیتی تو محسوس ہوتا کہ گویا ابھی کائنات اچھل پڑے گی۔ دھیمے سُروں میں دور کہیں گرتے آبشاروں جیسی آواز اور بہار موسموں میں گلاب کلیوں کی چٹخ جیسی مسکراہٹ۔ یا خدایا یہ تو نے کیا قیامت اجال ڈالی ہے۔ رات گئے وہ دونوں تو باتیں کرتے کرتے سوگئیں لیکن میں کھلی آنکھوں کے ساتھ انگاروں دہکتا رہا۔

بعد کے وقتوں میں اس کا آنا جانا معمول بن گیا۔ لیکن کوئی وقت متعین نہیں تھا۔ ماں جی نے تو ایک نشاں طے کرلیا تھا کہ جب جب سورج دور مغرب میں بڑے پہاڑ کے جنوبی کنارے پر چوٹی سے ہٹ ہٹ کر ڈوبنے لگے تو انہیں دنوں میں سے کسی دن اس کی گاڑی پہاڑوں سے اترتی سڑک پر سے فراٹے بھرتی ہوئی آ کھڑی ہوتی ہے۔ اور جب سورج بڑے پہاڑ کے شمالی کناروں پر سرکنے لگے تو یہ اس کی واپسی کا وقت تھا۔ میرے ساتھ انہی موسموں ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا اور پھر گویا عمر بھر کے لیے دور آسمانوں میں تکے چلے جانا اوران مسافروں کو تلاشنا کہ جو ہولناک بلندیوں میں پر پھڑ پھڑاتے ہوئے سیدھی لائنیں کھینچے چلے جاتے ہیں، میرا معمول بن گیا۔ ہوا یوں کہ سردیوں کی آمد کے دنوں میں، میں اپنی دوکان کے باہر تھڑے پر ایک دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یونہی گپ شپ چل رہی تھی کہ اچانک کوئی چیز دھم سے ہمارے درمیان آ گری۔ میں نے اٹھا کر دیکھا تو آنکھوں میں بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ وہ ایک مرا ہوا پرندہ تھا۔ لیکن اتنا خوبصورت، اتنا خوبصورت کہ اس جیسا نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ ملائمت اور نرماہٹ کا ایک ایسا شاہکار کہ جس کے ریشے ریشے سے رعنائی ٹپک رہی تھی۔ رنگ برنگے چمکیلے پر، پھول پنکھڑی ایسی آنکھیں اور تاشقندی فیروزے کی مانند دمکتی چونچ۔ میں حیران ہوا کہ یا خدایا یہ کیا عجب پرندہ ہے اور کہاں سے کس نے اسے مار پھینکا ہے۔ نہ جانے کسی آسمانی فرشتے کا جسمانی عکس ہے یا پرستانی پریوں کا کوئی مجسم ہیولا۔ میرے دوست نے اسے میرے ہاتھوں سے لے لیا اور مسکراتے ہوئے

کہنے لگا۔ جانتے ہو یہ کہاں سے گرا ہے؟ میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے آسمان کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا، وہ دیکھو! ان میں سے۔ اوپر دور بلندیوں پر پرندوں کے بہت سے
غول تکونی زاویوں میں اڑتے نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ برفیلے
پہاڑوں کے باسی پرندے ہیں۔ جب جب آسمان سے زہر بجھے دودھیلے پھول برسنے کا
وقت قریب ہوتا ہے تو یہ خاندانوں کے خاندان، جن کی تعداد لاکھوں میں ہوتی ہے گرم
علاقوں کی طرف ہجرت کرنے لگتے ہیں۔ میلوں میل انت بلندیوں پر ہواؤں کو چیرتے
ہوئے ان کا سفر دنوں جاری رہتا ہے۔ کڑے سفروں میں ان کو معلوم ہوتا ہے کہ کیا طریقہ
اختیار کرنا ہے۔ سو یہ ڈاروں کی شکل میں اڑتے ہیں اور ہر ڈار کا اپنا ایک تکونی زاویہ۔ تکون
کی آگے نکلی ہوئی نوک پر ڈٹ جانے والا باقیوں کے لیے ہواؤں کا جبر سب سے زیادہ سہتا
ہے۔ تُند تھپیڑے کھا کھا کے جب وہ ہلکان ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کو ستا لے تو اسی
ردھم میں اڑتا ہوا دائیں بائیں ہو جاتا ہے اور کوئی دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ پس وہ
ایک دوسرے کو سہارتے ہواؤں کا سینہ چیرتے چلے جاتے ہیں۔ طے یہی ہے کہ ان میں
سے کوئی تھک کر دم توڑ جائے تو دوسرے رکتے نہیں۔ اس کے لیے قبر کھودنے اور ماتم کناں
ہونے کی بجائے وہ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ اپنے زاویے میں ذرا پل کو خلا تک نہیں آنے
دیتے۔ کوئی دوسرا فوراً آگے ہو کر مرنے والے کی جگہ لے لیتا ہے۔ ہر سال بدلتے موسموں
کے ساتھ ان کا طے شدہ عمل یہی ہے۔ سردیوں کے آغاز میں میدانوں کو اترنے لگتے ہیں
اور جب پہاڑ برفیلے لحاف نوچ کر مہینوں اپنی کوکھوں پالے نقرئی خزانے اُگالنے لگتے ہیں تو
ان کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھو تند ہوا کے دھمکوں نے کیسے اس کا سینہ چھلنی چھلنی کر
رکھا ہے۔ آؤ اس حسن مجسمے کو کہیں دفن کر دیتے ہیں۔ آسمان قدر ناشناس ہے۔ زمین کے
پیٹ کے خزانے اندر ہی اندر سہمے ہوئے رہیں تو اچھا۔ اس واقعے کے بعد سے مدتوں تک
اُس کے آنے کی خبر ماں جی کی طرح مجھے بھی پہلے ہی مل جاتی۔ میں ان اڑتے ڈاروں کا

منتظر رہتا اور جب جب شمال سے اترتے یہ ہوائی قافلے میرے گھر کے اوپر سے گزرنے لگتے تو معلوم ہو جاتا کہ اب چند ہی دنوں میں وہ پہنچنے والی ہے۔ اور پھر واقعی اگلے چند دنوں میں وہ آوارد ہوتی۔ ڈاروں کی واپسی کے ساتھ وہ بھی واپس ہو جاتی۔

نہ جانے کیوں میں اس کا منتظر رہتا تھا۔ جب وہ آتی تو فرطِ مسرت سے میں کِھل کِھل جاتا اور جب جاتی تو اداسی کی ایک دبیز چادر سی مجھے ڈھانپ لیتی۔ ایک اَن دیکھا، اَن سوچا سا رشتہ اس کے ساتھ قائم ہو گیا تھا اور اس کے حوالے سے دور بلندیوں پر اُڑتے پرندوں سے بھی۔ دن بھر کام کاج میں مگن رہتا لیکن جب رات گھنی ہوتی تو خیالوں کا سلسلہ کہیں سے کہیں لے جاتا۔ یوں محسوس ہوتا کہ جیسے دور بہت دور نیلے آسمانوں کے اندر ہی اندر کہیں ایک سفید اجلے تخت پر وہ تکیہ لگائے بیٹھی ہے۔ اس کے چاروں طرف نور ہی نور ہے۔ اجلا پاکیزہ نور۔ ہواؤں میں پھول تیر تیر رہے ہیں اور عجب بھینی بھینی سی خوشبو فضاؤں میں پھیل رہی ہے۔ تخت مسلسل اڑا چلا جاتا ہے لیکن زمین کا کھردرا سا احساس برابر موجود ہے۔ یہاں منظروں میں دھندلاہٹ اور اندھیرا غالب ہے۔ جھکڑ، آندھیاں اور وحشت و خوف سے بھری سنسناہٹیں ہیں۔ میں ایک چٹانی پہاڑ پر کھڑا ہواؤں کے سامنے سینہ سپر ہوں۔ بدن جگہ جگہ سے پھٹ چکا ہے اور خونی جھکڑ میرے سینے میں سے سوراخ کرتے ہوئے نکل جانا چاہتے ہیں۔ تخت کا بہاؤ پرسکون ہے اور میں چیخ چیخ کر اسے دور بہت دور نکل جانے کا کہہ رہا ہوں، لیکن بے سود۔ میری چیخوں کے مقابلے میں ہواؤں کے زناٹے زیادہ پُرشور ہیں۔ اچانک ایک تند لہر یا اسے لپیٹتا ہوا بھنور یلے دائروں میں کھینچ لاتا ہے اور پھر سب تختہ تختہ ہو جاتا ہے۔ میرا جسم بھی کسی منہ زور تھپیڑے کے ہاتھوں لوتھڑا لوتھڑا ہو کر کہیں کا کہیں بکھر جاتا ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ بس ایک بے رحم گھماؤ کا احساس اور مسلسل ادھڑتے لوتھڑوں کی اذیت۔ یہ خواب سا میرے ذہن میں اکثر چابک مارتا دندناتا رہتا اور جب بھی وہ آتی تو میں انتہائی جذبوں کے باوجود اس سے ذرا دور رہی

رہتا۔ ماں جی نے بھی کہہ رکھا تھا کہ بیٹا وہ ہماری مہمان ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ اور مت سوچنا۔ ماں جی کو کیا پتہ کہ میرے لکڑی کے مضبوط تنے ایسے جسم میں اندر ہی اندر دیمک نے کتنے سینکڑوں ہزاروں رستے کھود ڈالے ہیں۔ پتہ نہیں ہم لوگ اپنا آپ کسی پر ظاہر کرنے میں کیوں ہچکچاتے رہتے ہیں۔ کیوں ہم اپنی زبانوں پر تالے اور آنکھوں پر آہنی چادریں ڈال ڈال بھونڈی مسکراہٹوں ہی پر اکتفا کیے رکھتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی اندر ہی اندر ٹوٹ رہی ہے اور ہر گزرتے سال اس کی تاب وتب میں گھمبیر اداسی کا سایہ مسلسل گہرا ہو رہا ہے لیکن مجھے معلوم تھا وہ اپنے حصاروں سے کبھی باہر نہ نکلے گی۔ میں بھی تو اپنے حصاروں سے باہر نہیں نکل پا رہا تھا۔ شاید ازلوں ازلی دائرے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

آخری بار جب وہ ہمارے گھر آئی تو ماں جی کو فوت ہوئے مہینوں گزر چکے تھے۔ دیر تک وہ بیٹھی روتی رہی اور میں بت بنا اس کی انگارہ بنتی آنکھوں سے اترتی لپٹوں کو دیکھتا رہا۔ اس پری صورت کا ہنسنا بھی عجب تھا اور رونا بھی عجب۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سینکڑوں رنگ اور ہزاروں جھلمل کرتی نور لکیریں اس کے گرداگرد عالمِ حیرت میں محوِ طواف ہیں۔ ایک ایسا گلاب کہ جسے سوائے نرم بہاری ہواؤں کے کسی اور نے چھوا تک نہیں۔ یا ایک ایسی مدھر تان کہ جسے الاپنے کو کسی درد سمندر میں ہزاروں بار اتر جانا بھی ناکافی ہو۔ میں بھی نہایت مغموم تھا اور باوجود کوشش کے اسے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر وہ خود ہی بول اٹھی۔ ماں جی کی شفقتوں کو یاد کرتی رہی۔ پھر کچھ رسمی سی باتیں اور آخر مکمل چپ۔ باہر سبز کیاریوں میں اب وہ پہلے سی رونق نہ تھی لیکن وہ حسبِ عادت اٹھی اور کیاری کیاری گھومنے لگی۔ ایک جگہ صد برگے کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس نے کئی پھول توڑ کر اپنی انگلیوں کی درزوں میں پرو لیے اور مٹھیاں بنا بنا مجھے دکھانے لگی۔ سرور و کیف اور خوشی اگر پاکیزہ لطافتوں کا نام ہے تو یقیناً اس وقت وہ مجسم حالت میں میرے سامنے آ موجود ہوئی تھیں۔ میں نے پہلی بار اسے نظر بھر کے دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اب یقیناً وہ تھک چکی ہے۔

گھور گھنیرے بالوں میں سفید چاندی کے تار جال بُننے لگے تھے اور بدن کے تُند تناؤ میں وقت کے تلخیلے تھپیڑوں کے آثار واضح تھے۔ ڈار میں سے تھک کر گرا ہوا برفانی پرندہ دفعتاً میری نظروں میں گھوم گیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس سے پوچھا، کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ اس نے کوئی جواب نہ دیا، بس چپ چاپ انگلیوں میں لگے پھولوں کو تکتی رہی۔ میں پھر گویا ہوا، کیا تم شادی کرو گی؟ وہ مسلسل پھولوں میں گم تھی۔ پھر اچانک جیسے بیدار سی ہوئی۔ نہیں، بالکل نہیں۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن لفظ اندر ہی اندر کہیں گم ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم نے ماں جی کی قبر پر حاضری دی اور اس کے بعد دیوتا پہاڑوں نے اسے اپنی طرف بلا لیا۔

ہر سال بدلتے موسموں کی روانی میں جب ست رنگے پرندوں کے ڈار ہولناک بلندیوں پر تیرتے میرے گھر سے گزرتے تو اس کی یادیں مہک مہک جاتیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ نہیں آئے گی لیکن شاید میرے اور اس کے تعلق کا حوالہ اب کوئی اور ہی اور تھا۔ شاید وقت کے دوراہے پر اب ہماری حیثیت ایک سی ہو گئی تھی۔ انت مسافتوں میں تند ہواؤں کو چیرتے چیرتے اب ہم اپنے اپنے ڈار میں اکیلے ہی باقی بچ رہے تھے اور ازلوں ازلی طے یہی ہے کہ منزل سے پہلے رکنا نہیں۔ دوست کی زبانی سنا تھا کہ جب ہواؤں میں تندی زیادہ ہو تو ہجرت کرتے پرندے ہزاروں کی تعداد میں مرتے ہیں۔ تکونی زاویے ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں۔ جب کبھی کسی ڈار کے سبھی پرندے دم توڑ جاتے ہیں اور کوئی ایک بچ رہتا ہے تو وہ اپنے آپ کو دوسرے ڈاروں میں مدغم کر دیتا ہے۔ یوں اگلی نوک پر رہ کر چھدتے چلے جانے کی بجائے نسبتاً آسانی کے ساتھ سفر جاری رہتا ہے۔ افسوس ہم سے تو ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا۔

دور اُفق میں سورج ڈھل رہا ہے۔ مغرب میں بلند پہاڑ کی چوٹی سے ذرا ہٹ کر شمالی کنارے کے پیچھے مسلسل سرک رہا ہے۔ یقیناً اب برفستانوں میں نقرئی خزانے ابل پڑنے

کا موسم آغاز ہو چکا ہے۔ آہ! خوش رنگ پرندوں کی واپسی کے دن ہیں۔ بچ رہنے والوں کو واپسی مبارک۔ سورج آدھے سے زیادہ پہاڑ پیچھے ڈھک گیا ہے۔ آج آسمان پر کوئی پرند نہیں۔ شاید کل سے واپسی شروع ہو گی۔ لیکن نہیں نہیں وہ ہے!! وہ جنوب کی طرف سے کوئی ہیولا سا اُڑا چلا آتا ہے۔ پرندے واپس جا رہے ہیں۔ پرندے واپس جا رہے ہیں۔ بچ رہنے والو تمہیں واپسی مبارک۔ نہ جانے خوشی کی انتہا تھی یا غم کی شدت کہ میں مسلسل اچھل اچھل ہاتھ ہلانے لگا۔ پرندے واپس جا رہے ہیں۔ پرندو جلدی کرو، دور بہت دور، جلدی جلدی نکل چلو۔ پرندو...... مجھے نہیں معلوم کہ کب سورج غروب ہوا، کب پرندوں کا ڈار اوپر سے گزرتا شمال سمتوں میں گم ہوتا چلا گیا اور کب میں دھاڑیں مار مار رونے لگا۔ ہوش آیا تو آنسوؤں سے چہرہ تر بتر تھا۔ ہوا کے تند گھماؤ میں مسلسل تیزی آتی جا رہی تھی۔ یقیناً پرندے جلدی تھک جائیں گے۔ شاید ان میں سے ایک بھی نہ بچے گا۔

کہو......کہو میری جان

مجھ سے مت پوچھو......خدارا مجھ سے کچھ بھی مت پوچھو......اس راکھ کو کریدو گے تو ادھ بجھے انگارے تمہاری انگلیاں جھلسا دیں گے، آبلے پڑ جائیں گے اور پھر تم مجھ سے خفا ہو کر منہ موڑ لو گے۔ میری طرف گھور گھور کے مت دیکھو، خدارا ایسا مت کرو اپنی ان محبت بھری آنکھوں میں دھول مت ڈالو۔ میرے اندر کا غبار سب کچھ دھندلا کر کے رکھ دے گا اور پھر تم پچھتاؤ گے، مجھے لعن طعن کرو گے، وقت گزر جائے تو چیخ و پکار کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ دیکھو!! کہ تمہارے دیکھنے کو اور بہت کچھ ہے۔ گلابوں بھرے موسم......رنگ برنگی کلیاں...... جھلمل کرتے ستارے......نیلگوں آسماں اور خوشبو بھری وادیاں۔ میرے پاس کیوں بیٹھتے ہو، جاؤ...... چلے جاؤ ورنہ میرے من کا تعفن تمہارے دماغ میں چڑھ جائے گا۔ بد بودار گندگی کے کیڑے مسلسل حرکت میں ہیں۔ مسلسل پھل پھول رہے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب یہ تم تک آ پہنچیں گے۔ پھر تم دیواروں سے سر مارو گے، رو رو کے برا حال کرو گے مگر کچھ ہاتھ نہ آئے گا، میرا گھلتا ہوا جسم سڑے ہوئے سیال کی صورت بہہ نکلنے کو تیار ہے...... ابھی وقت ہے، بھاگ جاؤ، مڑ کے دیکھنے کا خیال بھی مت لانا۔ میری باتیں سن کے کیا کرو گے، کیا کرو گے ان باتوں کا جن کے اندر پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بس آگ ہی آگ ہے۔ اس بہاؤ سے دور چلے جاؤ......دور بہت دور......زد میں آ گئے تو جم کے رہ جاؤ گے اور

میں کچھ بھی نہ کر پاؤں گا۔

میں کچھ بھی نہ کر پاؤں گا میری جان کہ ہمیشہ سے میرے بس میں کچھ بھی نہیں۔ وقت کے دھاروں پر ڈوبتا تیرتا میں نہ جانے کیا سے کیا ہوتا جارہا ہوں لیکن بے بسی ہے کہ مسلسل ساتھ ساتھ ہے۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا ہوں؛ چیخ چیخ کر، گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہنا چاہتا ہوں؛ مگر نہ روسکتا ہوں نہ کہہ سکتا ہوں۔ بس اک سوچ ہے، اک سوچ اور وہ بھی ادھوری، اک کرن......جس کے اردگرد دور تک اندھیروں کا سمندر ہے۔ میں اس کرن کو کہاں کہاں رکھوں، قریب جاتا ہوں تو یہ مجھے نگل لیتی ہے، دور جاتا ہوں تو اندھیروں کا لقمہ بن جاتا ہوں۔ خود کو ڈھونڈوں تو کہاں!! سوچ کی روشنی بھی مجھے کچھ نہ دے سکی اور اندھیرا تو ہے ہی اندھیرا۔ سو مری جاں میں کچھ بھی نہ کر پاؤں گا کہ ہمیشہ سے میرے بس میں کچھ بھی تو نہیں۔

تم قریب آئے تھے تو کچھ امید بندھ چلی تھی۔ تمہارے پیار بھرے لمس نے مجھے زندگی میں پہلی بار اک عجب کیف سے آشنا کیا تھا؛ تمہاری شوخ آنکھوں میں جھلمل کرتی روشنیوں اور ہونٹوں پر بکھری جمال پرور سرخیوں میں نہ جانے کیا تھا کہ میں پل بھر میں سب کچھ بھلا بیٹھا؛ دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ سوچ کی دھار سے دور اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتے تیرا اچانک سامنے آجانا اک عجوبہ ہی تو تھا۔ سو دم بخود رہ جانے کے سوا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ نہیں معلوم کہ پھر کیا ہوا، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا نہیں ہوا، بس اتنا یاد ہے کہ ہم مدتوں ساتھ ساتھ رہے۔ وقت کے دھاروں پر ایک ساتھ ڈوبتے تیرتے دور تک بہتے چلے گئے۔ تم میری امید بن کر ابھرے تھے، سو میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ تمہارے ساتھ ساتھ یونہی مسلسل بہے چلا جانا چاہتا تھا۔ لامحدود مدت تک کے لیے......سفر در سفر......لامتناہی رفاقت......بس یہی آرزو تھی۔

لامحدود مدت تک کے لیے چپ چاپ تمہارا ہم سفر بنے رہنا مجھے کافی تھا۔ مجھے اور

کرنا بھی کیا تھا۔ ہمیشہ سے بس جلتے بجھتے گھومے چلے جانا اور وہ بھی اس عالم میں کہ کہنے لگوں تو لفظ سکتے میں آ جائیں۔ سو میں نے تم سے کچھ بھی تو نہ کہا اور تم بھی عجب کہ بن کچھ سنے بن کہے میرے ساتھ ساتھ رہے۔ لفظ انگارے ہوتے ہیں...... دہک اٹھیں تو جھلسا کے رکھ دیتے ہیں۔ سب ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔ اچھا ہوا ہم دونوں کچھ نہ بولے۔ بول اٹھتے تو شاید اتنی مدت ساتھ نہ رہتے۔ بولنا عذاب ہے، غضب ہے، قہر ہے...... اور ہم ٹھہرے سدا کے مقہور، سدا کے مغضوب۔ آخر کب تک چپ رہتے۔ سو ہمیں بولنا پڑا۔ شرمسار ہوں کہ پہل میں نے ہی کی تھی۔ تم سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔ ہاں یاد ہے میں نے تم سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔ تم خاموش رہے اور مدتوں کچھ نہ بولے۔ شاید تم جانتے تھے کہ بولنا......

مدتوں چپ رہنے کے باوجود تم بہت کچھ کہتے رہے مگر میں نہ سمجھا۔ میں سمجھتا بھی کیسے کہ سمجھ کے لیے تو لفظوں کے انگاروں پر پلکوں سے جھاڑو دینا پڑتا ہے۔ پتلیوں کے بل قدم قدم رینگ کر چلنا پڑتا ہے۔ تب کہیں ذہن کے برفستان میں کوئی گولا سا پھٹتا ہے۔ کچھ دیر کو لہریے بنتے ہیں اور پھر سب ویسے کا ویسا۔ گولے مسلسل پھٹتے رہیں، لہریے بنتے رہیں اور مسلسل جمود ٹوٹتا رہے تو کہا جا سکتا کہ شاید کہیں سے سمجھ کا کوئی چشمہ پھوٹ پڑے لیکن ہمارے تمہارے درمیاں ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ سو میں کیسے سمجھتا' چپ چاپ تمہیں دیکھتا اور جواب کا انتظار کرتا رہا مگر تم نہیں بولے۔ شاید میں چاہتا بھی یہی تھا کہ تم نہ بولو اور میں انتظار کرتا رہوں...... انتظار کرتا رہوں۔ لامحدود مدت تک کے لیے۔ لامتناہی سفر کے لیے اس انتظار کا طویل تر ہونا ضروری تھا۔ تم جواب دے دیتے تو سفر کی طوالت اکتا دیتی اور پھر مجھے کوئی نیا سوال پوچھنا پڑ جاتا۔ نیا سوال...... انگاروں کے سمندر میں غوطے کھانے کا اک نیا سلسلہ۔ سو مجھے جواب نہیں انتظار عزیز تھا۔ میں نے تم سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا اور تم کچھ نہ بولے...... اسی پر مدتیں گزر گئیں۔ مجھے انتظار عزیز تھا اور شاید تم بھی

یہی کچھ چاہتے تھے۔

تم بھی یہی کچھ چاہتے تھے اسی لیے تو تم نے اشاروں ہی اشاروں میں کہہ دیا تھا کہ بوجھو تو بھلا میں کون ہوں! اب میرے لیے انتظار بھی تھا اور سوچ بھی۔ لذت کے دونوں دھارے ہم آویز ہوگئے۔ تم قریب تھے......بس یہی احساس کافی تھا۔ تم تھے کون؟ یہ تم نے بتانا اور میں نے سوچنا تھا۔ جواب تم دے سکتے تھے اور جواب شاید میرے پاس بھی تھا لیکن ہم بچھڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک دوسرے سے دور نہیں ہونا چاہتے تھے۔ پس ہم میں سے کوئی بھی نہ بولا اور سفر جاری رہا۔ مگر کب تک...... بولنے کا عذاب تو ہم ٹالنے سے رہے۔ ہم ٹھہرے سدا کے مقہور، سدا کے مغضوب......لفظوں کے پگھلے ہوئے سیسے میں ڈبکیاں لگاتے رہنا، جھلستے رہنا اور سسک سسک کر مرتے رہنا ہماری قسمت۔ سو باوجود چاہنے کے خود کو روکا نہ گیا اور ہم بول پڑے۔ تم بھی اور میں بھی۔

تم بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ میں بولتا رہا اور تم سنتے رہے۔ قصہ ایک ہی تھا مگر لفظ جدا جدا۔ سرخ سرخ دہکتے انگارے اپنے اپنے مگر جلن ایک سی؛ عذاب ایک سا؛ تم بھی وہی کچھ تھے جو کچھ میں تھا اور میں کیا تھا یہ تمہاری طرح میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ کاش ہم چپ چاپ چلتے رہتے اور کچھ نہ بولتے۔ بولنا عذاب ہے۔ تم نے بول کر اپنا پول کھول دیا اور میں نے اپنا۔ اب ہمارے درمیان کچھ بھی تو نہیں۔ کوئی کشش نہیں؛ کوئی تجسّس نہیں؛ کوئی چاشنی نہیں۔ ہم ایک دوسرے کی امید بنے رہتے، ایک دوسرے کے سہارے مدتوں گھومے چلے جاتے، ایک دوسرے پر تکیہ کیے رکھتے۔ تنہائی کا عذاب تو ٹلتا، اندھیروں کے عفریت نگل جاتے تو بھی اکٹھے تو تھے؛ وحشت تو نہ ہوتی؛ کرب کی سنگلاخ وادیوں میں ایک دوسرے کو ایک نظر دیکھ لینا ہی کافی تھا۔ کاش ہم کچھ نہ بولتے......لیکن نہ بولنا بھی تو عذاب ہے۔ کسی طرح بھی چین نہیں۔ کوئی بھی تو جائے پناہ نہیں۔ ہم سدا کے مغضوب؛ سدا کے مقہور۔ چپ بھی عذاب، بولنا بھی عذاب۔ جو ہوا سو ہوا......بھول جاؤ میری جان!!

جانے کیسے ہم مدتوں ساتھ رہے۔ مدتوں ایک دوسرے کو جلتے بجھتے دیکھتے رہے اور مدتوں ایک دوسرے کو کہتے سنتے رہے۔ وقت پگھل رہا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں مگر اب ہم نے کہنا نہیں۔ ہم نے وہی کچھ نہیں کہنا جو ہم دیکھ رہے ہیں، جو ہم سوچ رہے ہیں؛ کہ یہ سب کچھ تو بن کہے ہم جانتے ہیں۔ آؤ وہ کچھ کہیں جو ہم نہیں دیکھ رہے، جو ہم نہیں کر رہے اور جو ہم سے کبھی بھی نہ ہو سکے گا...... کبھی بھی نہ ہو سکے گا۔ ظاہر کا ملن اکتا دیتا ہے مگر یادیں! آہ یادیں! سنو میری جان!! قربت کی چاشنی میں سرانڈ پھوٹنے کا عمل آغاز ہو چلا ہے۔ نصیبوں میں لکھی ازلوں ازلی کھوٹ کبھی کھری نہیں ہوتی۔ تجسّس کے لبالب بھرے کٹورے خالی ہو چکے۔ اب کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی تو نہیں۔ سو چلے جاؤ۔ دیکھو! وہ نیلگوں آسماں، وہ جھلمل کرتے ستارے، وہ رنگ برنگی کلیاں اور وہ گلابوں بھرے موسم؛ تمہارے منتظر ہیں: اور شاید کوئی اور بھی: کہ جو تحیر بھری آنکھیں سجائے کسی نئی جھلملاہٹ کی راہ تکے جاتا ہے۔ خدارا جاؤ!!...... مجھ سے دور بہت دور چلے جاؤ۔ اب تم کہو! کہو میری جان؛ تم بھی مجھ سے یہی کچھ کہو؛ کہ ہم اس کے سوا ایک دوسرے کو اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔

چپ چاپ چلے سودائی......ہُو

سننے والے خوب قریب ہو ہو کر، کان لگا کر، پوری توجہ سے سننے کی کوشش میں تھے مگر پپڑی جمے خشک ہونٹوں کی ہر جنبش ہوا میں ہوا ہو جاتی۔ بے قراری بڑھ رہی تھی مگر کسی کے بس میں نہیں تھا کہ ہوا کی چھلنی سے ان لفظوں کو چھان لے جنہیں سننے کو کان ترس گئے تھے۔ آنکھیں بھی تو بند تھیں ظالم کی۔ کھُلی ہوتیں تو شاید ہونٹوں سے نکلتے بلبلوں میں بھی کوئی رس اُتر آتا۔ کاش کوئی اس کی آنکھیں کھول دے، کوئی اس کے ہونٹوں میں پھر سے رس بھر دے۔ کاش اے کاش کوئی اس کے ٹھنڈے ٹھار جسم میں انگارے بھر دے۔ سب کے لبوں پر یہی کچھ تھا مگر اس کے ہونٹ خالی تھے۔ سب کی آنکھوں میں نمی تھی مگر اس کی آنکھیں......اس کی آنکھیں نمی خشکی سے بے نیاز، سو رہی تھیں۔ وہ تو سوتے میں بھی مسکرا دیا کرتا تھا۔ مگر آج......اے کاش کوئی اس کی مسکراہٹیں واپس لے آئے۔ پھول سا چہرہ کتنا بجھ کے رہ گیا ہے۔ سب سے زیادہ سفید بالوں والی بوڑھی پریشان تھی۔ وہ اس کے ریشمی بالوں میں مسلسل انگلیاں پھیر رہی تھی، پچکار رہی تھی، رو رو کے بُرا حال کر رہی تھی مگر وہ بے سدھ پڑا تھا۔

......ڈاکٹر! ڈاکٹر! ڈاکٹر صاحب پلیز کچھ کرو۔ پلیز میرے بچے کو بچا لو۔ پلیز ڈاکٹر، پلیز......سفید بالوں والا بوڑھا ڈاکٹر کے پاس کھڑا الجاجت سے اس کا ہاتھ دبا رہا تھا۔

ڈاکٹر چپ تھا مگر اس کی نظریں لڑکے کے چہرے کو مسلسل تکے جا رہی تھیں گویا وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اب وہ بھی دوسروں کی طرح اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ بوڑھی عورت کے پاس ایک لڑکی کھڑی اسے دلاسہ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس طرح خود اپنے لیے دلاسہ ڈھونڈ رہی ہو۔ سوجھی ہوئی نیلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ پچھلے کئی دن سے وہ مسلسل روئے جا رہی ہے۔ بوڑھے کے پاس ایک نوجوان کھڑا انگلیاں مسل رہا تھا۔ چہرہ متغیر اور کبھی کبھی آنسو بھی ٹپک پڑتے لیکن وہ خاموشی سے انہیں ٹشو پیپر میں جذب کر لیتا۔ اضطراب میں کبھی بوڑھے کے پاس سے ہٹ کر ڈاکٹر کی طرف آ کھڑا ہوتا، اس سے کچھ کھسر پھُسر کرتا، کبھی کمرے کے دروازے کی طرف ہو جاتا اور کبھی ادھر سے ادھر ٹہلنے لگتا۔ چلتے ہوئے پنکھے کی سرسراہٹ گہرے سناٹے کو توڑ رہی تھی۔ کبھی کوئی سسکی اور کبھی کوئی سرد آہ......بس یہی کچھ تھا۔ دُعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ گھل مل کے ہر چیز ایک عجب سکتے میں آ گئی تھی۔

پڑی جسے ہونٹوں میں جنبش ہوئی، پلکیں کپکپائیں، سب اس کے قریب سمٹ آئے......سکتہ ٹوٹ گیا۔ لیکن لفظوں کی بجائے خون کے بلبلے گڑگڑاتے ہوئے اس کے منہ سے نکلے اور بہتے ہوئے گردن تک چلے گئے۔ قریب آنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ جلدی جلدی خون صاف کیا اور زور زور سے ورد کرنے لگے۔ ڈاکٹر نبض ٹٹولنے لگا۔ اندر ٹپ ٹپ کرتی زندگی کا شور پا کر قدرے مطمئن ہوا اور تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ چلتا وہیں آ کھڑا ہوا جہاں پہلے تھا۔ بوڑھے نے اس کی تقلید کی۔ نوجوان سے اب ضبط کرنا شاید بہت مشکل ہوا جا رہا تھا، تیزی سے اٹھا اور سر نیچا کیے تقریباً دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ اندر ہر چیز پر پھر سے سکتہ لوٹ آیا۔

سفید بالوں والی بوڑھی کو غش پہ غش آ رہا تھا لیکن اسے وہاں سے ہٹانا مشکل تھا۔ بار بار وہ اس کے گالوں کو سہلاتی، ہونٹوں پر بوسے دیتی اور ہاتھوں کو پکڑ پکڑ اپنی آنکھوں سے

لگاتی لیکن بے قراری مسلسل بڑھ رہی تھی۔ پاس کھڑی خوبصورت لڑکی گم صم، گم صم، چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے کچھ بڑبُڑا رہی تھی۔ ہونٹ ہل رہے تھے، آنکھیں بول رہی تھیں مگر لفظ گم تھے۔ نہ جانے لفظ گم کیوں ہو جاتے ہیں۔ یہی تو اصل سرمایہ ہیں۔ لفظ نہیں تو پھر سب کہا سنا بے معنی۔ سو اس کی بڑبڑاہٹ بے معنی تھی لیکن وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ لفظوں کے جبر سے نکل کر کچھ نہ کہتے ہوئے بھی وہ سراپا اظہار بن گئی تھی۔ معنویت کی ایک عجیب و غریب سطح آغاز ہو رہی تھی۔ یہاں معنی لفظوں کے محتاج نہ تھے۔ کہے سنے کی صورت مختلف تھی اور موجود و ناموجود کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ وہ سراپا اظہار تھی۔ پوری معنویت کے ساتھ لیکن بظاہر لفظ گم تھے، معنی گم تھے، وہ گم تھی، مگر موجود اور مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

باہر جانے والا نوجوان کچھ دیر بعد لوٹ آیا۔ مضطرب نگاہوں سے سب کو دیکھا اور چپ چاپ سفید بالوں والے بوڑھے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ بوڑھے نے ذرا پل اس کی طرف دیکھا اور پھر گردن جھکا لی۔ اب اس کی آنکھیں بھی بھنچی ہوئی تھیں اور ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ استغراق کے عالم میں ذہن کے جھکڑ تیز تر ہو گئے۔ سوچیں امڈے چلے آتی تھیں لیکن وہ سب سے پہلو بچاتا فقط ایک نقطے پر اپنے آپ کو مرکوز رکھنے کی کوشش میں تھا۔ نقطے ہی نقطے...... بے شمار نقطے، جو تیزی سے اِدھر سے اُدھر جھلملاتے ہوئے نکل رہے تھے، کوئی ٹھہراؤ نہیں، بس تیزی تھی، ہلچل تھی اور چکا چوند...... ایسی چکا چوند کہ ہر چیز شعاعوں میں بدلتی چلی گئی۔ سب کچھ تھا اور محسوس بھی ہوتا تھا مگر دکھائی نہ پڑتا تھا۔ بس تیزی سے حرکت کرتی شعاعیں...... اندر اترنے کے لیے شعاع بننا ضروری تھا سو اس نے اپنی سی کوشش کی اور اب وہ ان شعاعوں کے بیچوں بیچ تھا۔ وہ پکار رہا تھا، التجائیں کر رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا مگر اپنی ہی بازگشت کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیا۔ لیکن وہ پُر امید تھا اور جانتا تھا کہ اسے سنا جا رہا ہے۔ سو وہ گڑگڑاتا رہا اور شعاعوں کے بیچوں بیچ ایک انجانی منزل کو رواں دواں۔

بے سدھ پڑے نوجوان کو پھریری ہوئی۔ اب کے شدت زیادہ تھی۔ خون کے ساتھ

چھوٹے چھوٹے لوتھڑے بھی تھے۔ سب ہڑ بڑا اٹھے اور اس کے قریب یوں سمٹ آئے جیسے کسی نے انہیں پیچھے سے دھکا دے مارا ہو۔ ڈاکٹر نے حسبِ سابق نبض ٹٹولی۔ اندر زندگی ٹپ پار ہی تھی۔ بوڑھی نے چہرے پر سے خون صاف کیا اور یوں پھسک پھسک کے روئی کہ سب کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ تھوڑی دیر بعد سب ویسے کے ویسے ہو گئے جیسے کہ تھے۔ ڈاکٹر کے خیال میں اب کسی خیر کی امید رکھنا بے سود تھا۔ بوڑھے کو تھپکی دیتے ہوئے وہ اپنے ساتھ باہر لے آیا۔ واجبات کی ادائیگی کر دیجیے، ہمارے بس میں اب کچھ بھی نہیں، اس نے سرگوشی کی۔ میں دیگر معاملات کا انتظام کرتا ہوں، آپ چیک دے دیجیے اور اندر جائیے۔ بوڑھے نے خاموشی سے چیک کاٹا اور کمرے میں واپس آ گیا۔ اندر سکتہ ویسے کا ویسا تھا۔

......باہر موسم خوشگوار ہو رہا تھا۔ اودھی اودھی چنچل بدلیاں پلو ہاتھ میں لیے اِدھر سے اُدھر لہرا رہی تھیں۔ بہار کے بیچوں بیچ کے دن تھے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور گھنے درختوں کے ٹھنڈے سایوں میں ہجوم امڈ آیا تھا۔ ہاتھوں میں آئس کریم لیے وہ بھی ادھر ٹہلتے پھرتے تھے۔ وہ کہ جو اجالوں کے خواب بُننے کے لیے نئے نئے قریب ہوئے تھے۔ نیلی آنکھوں اور لمبے سنہرے بالوں والی ہاتھ میں پکڑی آئس کریم کو ہولے ہولے چھوتی مسلسل مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ جھک جھک کر اس کے کان میں سرگوشیاں کرتا، اس کے چہرے کے سامنے چہرہ لا کر آنکھیں نکالتا اور کبھی اس کے چاروں اور گھوم کر لڑکھڑاتے ہوئے ادھر ادھر جھومنے لگتا۔ دونوں کھلکھلاتے جاتے، آئس کریم کی چسکیاں لیتے جاتے اور ٹھنڈے سایوں میں بکھرے ہجوم میں گھومتے جاتے۔

اچھا تو تم مجھ سے دھوکا کرو گی، فریب دو گی اور مجھے ہمیشہ تنگ کیا کرو گی......

ہوں!......یعنی تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں نرا بودا ہوں۔ واہ بھئی واہ، کیا کہنے، گلا گھونٹ کے رکھ دوں گا چڑیل کا۔ کسی بھول میں مت رہنا، اور ہاں یہ جو تمہاری نیلی نیلی کبوتر جتنی آنکھیں ہیں ناں، یہ بھی نکال دوں گا۔ پھر سفید چھڑی لے کے گھومنا در بدر۔ سمجھ آیا......

دونوں کھلکھلائے۔ ہوا ترنگ میں آ گئی اور رشک کرتی پچھلے پیروں گھوم گئی۔ خدا قسم تم ہو ہی نرے بودے۔ ابھی تک تو تمہیں ٹائی باندھنے کا طریقہ بھی نہیں آیا۔ روز مجھے مصیبت پڑی ہوتی ہے۔ اور یہ بال دیکھے ہیں اپنے، چڑیوں کا گھونسلا پھر بہتر ہوتا ہے۔ اس نے ناک بھوں چڑھائی، تیوری پر بل ڈالے اور نیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سامنے آ کھڑا ہوا۔ اچھا تو میں بودا ہوں؟؟ ہاں ہوناں۔ تمہارا مطلب ہے مجھے ٹائی تک باندھنا نہیں آتی؟؟ ہاں نہیں آتی۔ میرے بال بھی چڑیوں کا گھونسلا ہیں؟؟ گھونسلے سے بھی بدتر۔ نیلی آنکھوں میں شرارت اُنڈ اُنڈ کے آبسی تھی۔ اچھا تو تم مجھے تنگ کیا کرو گی؟؟ تو اور کیا۔ اس نے جھپٹ کر نرم گداز ہاتھوں سے آئس کریم چھین لی اور پل میں ہڑپ کر گیا۔ لو اب کرو تنگ...... قہقہوں کا جھرنا لہراتا بل کھاتا بہہ نکلا۔ چمکیلے چھنچھناتے لہریے ہواؤں میں بکھرتے گئے اور ہوائیں رشک کرتی پچھلے پیروں گھومتی رہیں۔

......نوجوان کو پھر زور کی قے آئی۔ وہ اچھلا، تڑپا اور خون اُگل کر دوہرا ہو رہا۔ چہروں پر پھیلی ہوئی دھند میں اب کہر پھیلنے لگا تھا۔ سکتہ گہرا ہو رہا تھا، گویا کہ کسی نے منتر پھونک دیا ہو۔ اچانک ایک طرف حرکت ہوئی۔ نیلی آنکھوں والی دھیرے دھیرے چلتی بستر کے قریب ہونے لگی۔ ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے مگر چہرہ برف کی سِل بنا پڑا تھا۔ قریب اتنی قریب ہوئی کہ دو قوسوں کے درمیان کا فاصلہ رہ گیا یا شاید اس سے بھی کم۔ آنکھوں میں چمک اُنڈ آئی تھی۔ ایسی چمک کہ گویا ابھی چاہے تو سارا منظر بدل کے رکھ دے۔ سب اسے حیرت سے تکنے لگے مگر سکتہ جوں کا توں تھا۔

دو قوسوں کے درمیان کا فاصلہ کچھ دیر بعد مزید کم ہو گیا۔ تم ایسے سدھرنے کے نہیں، تمہارے ساتھ کوئی اینکی پھینکی کرنا ہی پڑے گی۔ سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ تم نے تو ہمیشہ ساتھ رہنے کے وعدے کیے تھے۔ اب کیا ہوئے وہ سب۔ تمہیں ساتھ دینا پڑے گا۔ سنا تم نے......ساتھ دینا پڑے گا۔ محبت کے حسین پاکیزہ لمس کی قسم تمہیں میری بات

سننا پڑے گی۔ نیلی آنکھیں بڑبڑاتی رہیں اور وقت گویا سانس روکے ان کے پہلو میں سہما، چپکا پڑا رہا۔

وہ اس کے چہرے پر بچھی پڑی تھی۔ آنکھیں آنکھوں میں پیوست اور چمک تھی کہ مسلسل تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ بوڑھی نے آگے بڑھ کر اسے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ جھکی رہی۔ آنکھیں آنکھوں سے ملن کے لیے تڑپ رہی تھیں اور پھر نہ جانے یہ تڑپ کی شدت تھی یا کچھ اور کہ آنکھوں نے آنکھوں کو اُچک لیا۔ عجب معجزہ ہوا کہ دیکھنے والے گنگ رہ گئے۔ بے سدھ پڑے نوجوان کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ اوپر کھلی آنکھوں میں چمک اور تیز ہوگئی۔ انگارے پگھل پگھل کر پھیلنے لگے۔ بن لفظوں کے اظہار کی بے قراری ابل پڑی اور پھر سب نے دیکھا کہ اچانک سوئی ہوئی آنکھیں جاگ اٹھیں۔ پیلی زرد مردہ سی آنکھیں اپنے اوپر جھکی زندہ آنکھوں کی لپک دیکھ کر جگمگانے لگیں۔ سب جھٹ سے قریب سمٹ آئے لیکن آنکھیں تو بس آنکھوں میں محو تھیں۔ اظہار ہو رہا تھا۔ زندگی زندگی کو سمجھ رہی تھی لیکن لفظ نہیں تھے۔ لفظوں سے کہیں بڑھ کے کوئی عالم تھا۔ پیلی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں اور نیلگوں پانی پھیل پھیل سمندر بنتا چلا گیا۔ آنکھیں آنکھوں میں اتر رہی تھیں۔ نوجوان کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری اور گم ہوگئی۔ اظہار و معنویت کا نیا سفر آغاز ہو رہا تھا۔ زندگی نے زندگی کو اُچک لیا مگر کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ لڑکی دھم سے نوجوان کے سینے پر گری تو سب ہڑبڑا اُٹھے۔ ڈاکٹر آیا، دونوں کو ہلا جلا کر دیکھا، نبض ٹٹولی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

بوجھل آنکھوں میں اُترتی جھلمل

رات اچانک آنکھ کھلی تو ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اوّل اوّل اپنا آپ ایک بھاری سِل کی مانند محسوس ہوا۔ ذہن کے اندر مدھم چاندنی کی طرح سے کسی بے نام تسلسل نے رفتہ رفتہ انگڑائی لی اور کچھ بے قاعدہ سے لہریے ابھرنے لگے۔ بدن میں تھکی تھکی سی حرکت ہوئی اور خیال گزرا کہ میں کسی سخت تختے پر چت لیٹا پڑا ہوں۔ سمتوں کا تعین نہیں ہو پا رہا تھا اور نہ ہی یہ اندازہ تھا کہ اس لمحے وقت کا دورانیہ کیا ہے۔ شاید گوشت کے لوتھڑوں سے نکلی ہوئی روح دوبارہ سے اپنا دخول پا رہی تھی۔ بوجھل بوجھل بے جان خلیے کسی غیر مرئی حرارت سے پھڑ پھڑانے لگے اور پھر جب یہ عمل مکمل ہوا تو پہچان اور احساس کی گرمی سارے جسم میں سرایت کرتی چلی گئی۔ کھلی آنکھوں میں کوندے سے لہرائے اور لطافت کا ایک عجیب وغریب سلسلہ آغاز ہو گیا۔ حافظے کے اندر سے لفظوں کے بلبلے تیرتے ہوئے نکلے اور ناموں کی گونج سی تھرتھراتی ہوئی پھر وہیں سے آغاز ہو گئی جہاں نیند سے پہلے رکی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد محسوس ہو گیا کہ میں پتھریلی دیواروں کے بیچوں بیچ کہ جن کی گولائیاں فوراً ہی باہم مل کر چھت میں پیوست ہو جاتی ہیں، عین وسط میں الٹے ہاتھ کا سرہانہ بنائے لیٹا ہوا ہوں۔ غار کے اندر گھپ اندھیرا ہے۔ سامنے موجود تنگ سے دہانے کے اس پار بھی مکمل اندھیرا۔ یقیناً ابھی رات ہے مگر کون سا پہر......؟؟ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ سمتوں کا تعین

بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔

غار میں کچھ کھسر پھسر سی ہوئی۔ ایسے کہ گویا کوئی پرندا اپنی چونچ سخت پتھر پر رگڑے چلا جاتا ہے۔ غالبًا کوئی کبوتر تھا۔ آواز میرے دائیں سمت کی دیوار سے ابھری تھی۔ سر کی جانب بھی دیوار اور پاؤں کی جانب بھی دیوار۔ بائیں طرف دہانہ تھا۔ تنگ مگر ایک آدمی کے گزرنے کو کافی۔ کبوتر ضرر رساں نہیں لیکن اگر شیر یا چیتا یا بھیڑیا کہیں سے آ نکلا تو پھر۔ ان کے پاس طاقت بھی زیادہ ہے اور چیر پھاڑ کھانے کا ہنر بھی۔ تو کیا پھر باہر چلے جانا چاہیے......؟؟ نہیں نہیں باہر تو ان کا کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔ اندر اتنا تو ہے کہ تین اطراف دیواریں ہیں اور اوپر چھت۔ خطرہ بس ایک ہی طرف سے ہے۔ کبوتر کو بھی خطرہ ایک ہی طرف سے ہے۔ میں اس کی کھو میں ہاتھ ڈال کر اسے پکڑ سکتا ہوں۔ اور اگر وہ مجھ سے بچ کر باہر نکل گیا تو پھر ہر طرف سے اس کی تاک میں بیٹھے ہوئے، جھپٹ پڑیں گے اندھیروں میں کچھ بھی تو سجھائی نہیں دیتا اور جب سمتوں کا احساس بھی جاتا رہے تو پھر کیا کبوتر، کیا میں اور کیا کوئی اور۔

یاد آیا کہ میں روشنی کی تلاش کا ارادہ کر کر گھر سے نکلا تھا۔ میرا گھر نہ جانے زمین کے کس سرے پر ہے لیکن اس کے قریب ایک بڑا دریا ہے۔ دریا کے اس پار جنگل اور جنگل کی اوپری سمت بڑے بڑے پہاڑوں کا ایک وسیع سلسلہ۔ میرے گھر کی چھت سے دریا نظر نہیں آتا بلکہ جنگل بھی نہیں کہ درمیان میں دیو قامت عمارتیں ہیں۔ عمارتوں کے بیچوں بیچ البتہ پہاڑوں کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ دور سے دیکھو تو شہر کا ہر ہر منظر سہانا ہے۔ اونچے نیچے برج، مینارے، محل، مسجدیں اور مکانوں کا ایک سے ایک آراستہ و پیراستہ سلسلہ۔ لیکن اندر سب گند بھرا ہے۔ بڑی سڑک پر گاڑیوں کا اژدہام، گلیاں، جوہڑوں اور تالابوں کی مانند اور برقی تاریں سروں پر موت کے پھندے بن کر لٹکی ہوئیں۔ دھواں، شور، گندگی اور سب سے بڑھ کر حاکم شہر کہ جس کو مارنے کو ہر شخص درپے ہے مگر وہ مرتا نہیں۔ مر

جاتا ہے تو دوبارہ اس سے کہیں کریہہ صورت میں جی اٹھتا ہے۔ سو یہاں زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک گٹرابلا پڑا ہے۔ دلوں میں اندھیر بھرا ہے اور اندھیروں میں کسی سمت کی تلاش ہو تو کیسے ہو۔ پس میں چارو ناچار وہاں سے نکلا مگر زمین کی محبت۔ آہ زمین کی محبت۔ آخری بار بلند پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر میں نے شہر کا نظارہ کیا اور یقیناً یہی کہا تھا کہ اے پیارے شہر! تو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ تیری مٹی سے بچھڑنا محال ہے لیکن کیا کروں کہ تیرے چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا ہے روشنی کی تلاش میں کسی ایک کو تو نکلنا ہی ہے۔

سنا تھا کہ جب زمین کی پیٹھ پر جینا ابتر ہو جائے تو اس کے پیٹ میں اتر جانے والوں کو خوشخبری ہے۔ پرانے زمانے کے ان خوش بختوں کا قصہ تو مثل بن چکا کہ جب انہوں نے اپنے آپ کو اندھیروں میں غرق ہوتے پایا تو چپکے سے راتوں رات کہیں دور جانے کی ٹھان لی۔ اگرچہ ان کی تعداد کا تعین نہیں۔ کچھ کہتے ہیں وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ وہ چھ تھے اور ساتواں اُن کا کتا۔ مگر اس پر سبھی کا اتفاق ہے کہ وہ تھے اور ان کے ساتھ ایک کتا بھی۔ پس وہ راتوں رات نکلے اور اندھیروں کو چیرتے ہوئے تنگ گھاٹیوں کے بیچوں بیچ ایک غار میں جا پناہ گزیں ہوئے۔ اکیلے میں وقت کٹتا تو کیونکر، اور وہ اپنے جسم کی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہوتے تو کیسے، سو ہونی ایسی ہوئی کہ دست غیب نے ان کی مدد کی اور نیند کا ایسا خمار اترا کہ برسوں برس وہ پڑے سویا کیے۔ کتا بھی غار کے دھانے پر لیٹا جاگتا اونگھتا کروٹیں بدلتا رہا۔ برسوں بعد اٹھ جانے کی آواز کان میں پڑی تو وہ سب کے سب دوبارہ سے گویا جی اٹھے۔ کتے کو ہش ہش کی تو وہ بھی پہلے کے جیسا پھرتیلا۔ حیران ہوئے کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہوا۔ مگر اندر کی باتیں جانے کون۔ باہر روشنی ان کی منتظر تھی۔

کسی بزرگ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میاں روشنی اصل الاصول ہے۔ دن کو سورج یہ کام کرتا ہے اور رات کو ماہتاب اور ستارے۔ ابر آلود گھور گھنیری راتوں میں بھی روشنی کا ہلکا

سا پر تو جھلملاتا رہتا ہے۔ ظاہر کا یہ عالم باطن پر بھی منطبق ہے۔ کبھی امیدوں کا سورج سوا نیزے پر آن کھڑا ہوتا ہے، کبھی تیکھی چاندنی اور کبھی گنگناتے تاروں کی چُن بُن ۔ مایوسیوں کے گھمر گھیروں میں بھی کوئی مدھم سی کرن کہیں سے نظر کے دائروں میں اترتی رہتی ہے۔ پس روشنی کو تلاش کرو، زمین کی پیٹھ پر ملے تو بھی اور پیٹ میں ملے تو بھی۔ روشنی ہے تو چیزوں کے نام اور سمتوں کا تعین بھی ہے۔ یہیں کہیں وقت کا جھرنا بھی بہے چلا جاتا ہے۔ کہنے کی باتیں نہیں محسوس کرو اور جانو۔ یاد ہے کہ بے ساختہ منہ سے نکلا تھا، یا حضرت! روشنی آتی کہاں سے ہے......؟

بزرگ نے تبسم کیا اور فرمایا: میاں! روشنیوں والے سے۔

میں نے پوچھا یا حضرت: روشنیوں والا کہاں ہے؟

فرمایا: تیرے اندر رَچا بسا ہے۔ ذرا غور کر۔

میں عرض گزار ہوا، یا حضرت اسے پہچانوں کیسے؟

فرمایا: تو تمنا کر، پہچان وہ خود کرا دے گا۔

غار کے اندر گھپ اندھیرا تھا اور بیدار ہونے کے بعد سے میں نے پتھر پر کسی پرند کی چونچ رگڑنے کی آواز کے سوا کچھ نہ سنا۔ دھانے کے اس پار بھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ذرا دھمکیلی آواز میں ہُش ہُش کی تو کبوتر پھڑ پھڑاتا ہوا اپنی کھوہ سے اڑا اور دھانے سے باہر نکل گیا۔ اچانک بھاری پروں کی آواز نے سناٹے کو چیرا، ساتھ ہی ایک چیخ سی ابھری اور پھر خاموش جوں کی توں۔ یقیناً کبوتر کو کسی شکرے نے پھاڑ کھایا تھا۔ خوف کا شدید احساس سنسناتا ہوا رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ کھلے دھانے میں سے اگر کوئی شیر آ دھمکا تو میرا کیا بنے گا۔ لیکن باہر جانا بھی تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔ کبوتر کا حشر نشر سامنے ہے۔ اندر خیر اتنی تو عافیت ہے کہ تین اطراف مضبوط دیواروں کا حصار اور اوپر چھت۔ مگر اکیلے میں وقت کٹے تو کیسے اور وہ بھی ایسے عالم میں کہ مکان کا تعین بس اس قدر

کہ میرے بائیں طرف دھانہ ہے۔ سر، پاؤں اور داہنی جانب پتھریلی دیواریں، اوپر چٹانی چھت اور نیچے پتھریلا تختہ۔ زمان کا احساس فقط اتنا کہ جب سے آنکھ کھلی ہے، اندھیروں کا ٹھہراؤ ہے اور کبوتر کی چونچیلی آوازوں سے اس کی موت تک، کوئی بہاؤ سا گزر چکا ہے یا اندر ہی اندر یاد اور خیال کا ایک گڈمڈ ہوتا سلسلہ۔ تو کیا وقت بس یہی کچھ ہے۔ جان لینا تو پہچان سے وابستہ ہے اور وقت کی شاید کوئی پہچان ہے ہی نہیں۔ بزرگ کے الفاظ کہیں سے دوبارہ ذہن میں گونج پیدا کرنے لگے۔ میاں روشنی ہے تو چیزوں کے نام اور سمتوں کا تعین بھی ہے۔ یہیں کہیں وقت کا جھرنا بھی بہے چلا جاتا ہے۔ کہنے کی باتیں نہیں محسوس کرو اور جانو۔ میاں روشنی کا تعلق روشنیوں والے سے ہے اور وہ تیرے اندر ہے۔ تُو تمنا کر، پہچان وہ خود کرا دے گا۔ دفعتاً مجھ پر نیند کا سایہ سا لہرایا اور پھر رفتہ رفتہ اس کی گرفت مضبوط ہونے لگی۔ دور تک دھند کی چادر سی بچھ گئی۔ آنکھیں بوجھل ہوئی اور روح کا عمل ساکت ہوتے ہوتے انتہائی مدھم سُروں میں ڈھلتا چلا گیا۔ اندر روشنیوں کا ایک عجیب و غریب عمل تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک اپنا آپ کھولتی جھلملاتی روشنیاں۔ دن رات کی کروٹوں سے بے نیاز۔ میں نے محسوس کیا کہ معانی کے کیف آور تسلسل کے ساتھ، پہچان کا ایک نیا سفر آغاز ہو رہا ہے۔

جاڑوں میں کھلا خواب

یخ بستگی کے ہاتھوں چُور چُور رات میں جب پچھلے پہر کا سناٹا کوکنے لگا اور اندھیروں کی خرخراہٹ گھمبیر ہوتے ہوتے وحشت کی آخری حدوں کو جا پہنچی تو بابا اپنی کملی سنبھالے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چولہے میں آگ سلگا چلم بھری، دیا بجھا ایک طرف رکھا اور چھپر سے باہر نکل اپنی چوکی پر آ بیٹھا۔ نہر کنارے درختوں کے جھنڈ تلے حقے کی گڑگڑاہٹ، بہتے پانیوں کا شور اور بابا۔ ایسے عالم میں کہ جب جاڑے کے خوف سے ہوا بھی بُکل مارے سہم سہم جاتی تھی۔ بابے کا یوں سینہ تانے ننگ دھڑنگ باہر بیٹھ رہنا عجب تھا۔ صرف ایک کملی اور وہ بھی لیر و لیر، لنگوٹ بھی بس ایسا ہی تھا کہ جس سے بمشکل ستر ڈھک سکے۔ بڑے ڈیل ڈول کا جثہ ہوتا تو بھی کچھ کہنے کی بات تھی مگر یہاں تو بس ہڈیاں رکھی پڑی تھیں۔ ایک سوکھی جھاڑی کہ جس پر میوے لگے برسوں گزر چکے ہوں۔ یا ایک اُدھڑا ٹیلہ کہ جس کا جوبن ہوائیں لے اڑی ہوں۔ مگر وہ اس شانِ بے نیازی سے بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا کہ جیسے کوئی بالک ماں کی گود میں اپنے کھلونے سمیٹے اطمینان سے دبکا پڑا ہو۔ بل کھاتی لٹیں داڑھی میں پیوست ہوئی جاتی تھیں اور داڑھی پھیل پھیل پیٹ تک ڈھلک آئی تھی۔ پچکے ہوئے گال، چوڑا ماتھا، سانولا رنگ اور نشیلی بادام آنکھیں۔ بڑھاپے کی کوئی سی نشانی بھی تو ہویدا نہ تھی۔ نہ بال سفید نہ جھریوں بھرا چہرہ نہ رعشہ زدہ بدن۔ مگر مجھے جو حکم ہوا تھا اس میں اسے بابا کہہ کر ہی پکارا گیا

تھا سو آنکھوں دیکھ کر بھی میں اسے بابا ہی کہوں تو اچھا کہ حکم والے کے مقابلے میں میری آنکھیں بھُس سے زیادہ کچھ نہیں۔

مجھے بابے تک پہنچنے کا حکم کس نے دیا، کب دیا اور کیوں؟ اس بابت میں بھی کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن بس اتنا یاد ہے کہ بلوغ کی ٹہنی کو چھو کے جب میں نے ترنگ بھری وادیوں کی طرف ڈگ بھرنے شروع کیے اور جب شباب دھمالیں ڈال ڈال مدہوش ہوا جاتا تھا تب کہیں کسی رات کانوں میں کوئی رس سا اترتا محسوس ہوا۔ میں مگن تھا کہ سرگوشی ہوئی، جوان! چل نہر کنارے درختوں کے جھنڈ تلے بابے کو تلاش کر۔ جلد پہنچ...... میرے تھرکتے قدموں پر گویا کسی نے میخیں ٹھونک ماریں۔ بدن عرق عرق ہوا اور پھر کئی دن تک خوف نے چادر تانے رکھی۔ منتظر رہا کہ شاید آواز پھر سے ابھرے۔ مگر کہیں سے کوئی پتا تک نہ کھڑکا۔ گمان گزرا کہ ہو نہ ہو یہ شباب کا واہمہ ہو یا نشیلی ترنگوں کی کوئی بھٹکی ہوئی پرچھائیں کہ جو محض ستانے کو یونہی کان کنارے گھسی چلی آئی ہو مگر سب طفل تسلیاں تھیں۔ سرگوشی کا لفظ لفظ ذہن میں کھدا پڑا تھا اور بھلائے جانے کی لاکھ کوششوں کے باوجود مسلسل نقش رہا۔ اپنے گاؤں کے قریب بہتی نہر کے دونوں کنارے میلوں میل میں نے چھان مارے اور بے قراری کے عالم میں درختوں کے ایک ایک جھنڈ میں پہروں پھرا کیا لیکن بابے کی کچھ خبر نہ پائی۔ بارہا ایسا ہوا کہ ارادہ باندھا دور سفروں کا کہ شاید کہیں کسی اور نگری میں کسی اور نہر کنارے میری منزل بچھی پڑی ہو مگر عجیب تھا کہ جب بھی ایسا سوچ قدم بڑھایا، راستوں کے بھوت گھما گھما مجھے اپنے ہی گاؤں کے گرداگرد پھراتے رہے اور میں باوجود کوشش ایک سوت بھر بھی ان دائروں سے باہر نہ نکل سکا۔

وقت کی دھند میں اُگے پھول کھلتے کملاتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ سوچ کی ہتھیلی پر نقش لفظوں کا چولا بھی بدلتا رہا لیکن بابے کی تلاش کا حکم مسلسل کانوں میں دھمک ڈالتا پل بہ پل مجھے بے چین کیے رہا۔ نہیں معلوم کہ کہنے والے پر میرا باطن کیسے آشکارا ہوا اور اس نے

حکم سنا کر میرا اضطراب دو چند کر دیا۔ حالانکہ اصل تو یہ ہے کہ بابوں سے میرا کوئی ازلوں ازلی تعلق بنتا ہے اور رات کے سناٹوں میں بہتے پانیوں کا شور اور حقے کی گڑگڑاہٹ......
مجھے خوب خوب یاد ہیں بچپنے کی وہ خواب آلود مدھم شامیں کہ جب میں کھانے سے فارغ ہو سیدھا نانا جی کے گھر جا دھمکتا۔ نانا جی، خدا بخشے، کمال کے قصہ گو تھے۔ بان کی چارپائی پر الٹے ہاتھ کا تکیہ بنا ٹیک لگا بیٹھتے اور حقے کی گڑگڑ میں ہر بار کہانی یہیں سے شروع ہوتی کہ لے بھئی نیک بختا! پرانے وقتوں کی بات ہے...... میں ٹوکتا، نانا جی! آپ روز پرانے وقتوں کی کہانی سناتے ہیں، کوئی کہانی نئے وقتوں کی بھی تو ہونی چاہیے۔ وہ مسکرا کر حقہ گڑگڑاتے اور کہتے! نیک بختا! کہانیاں پرانے وقتوں کی ہی اچھی، نئے وقت تو بس...... پھر کہانی شروع ہوتی اور میں دیکھتا کہ گویا حرف حرف نانا جی پر نازل ہو رہا ہے۔ بیچ بیچ میں وہ اپنے مخصوص انداز میں کان پر ہاتھ رکھ کر شعر بھی الاپتے جاتے۔ بوسیدہ سے کمرے میں دیئے کی مدھم روشنی، سناٹوں کی پراسراریت، حقے کی گڑگڑاہٹ اور قصے پرانے وقتوں کے۔ نہ جانے کب کہانی خمار آلود ہوتی اور ماں جی آ کے مجھے بغل بیچ دبا لے جاتیں۔ سوتے میں بھی یوں لگتا کہ جیسے نانا جی ٹیک لگائے قصہ اگال رہے ہیں۔ حقہ گڑگڑا رہا ہے اور خاموش مدھم روشنیوں میں، میں بیٹھا سن رہا ہوں۔

ماں جی اکثر کہا کرتی تھیں کہ بیٹا تیرے پرنانا، خدا جنت نصیب کرے، بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ دن بھر کھیتوں میں کام کرتے کہ جدی پشتی یہی پیشہ چلا آیا تھا اور راتوں اُٹھ اُٹھ عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ اونچا لمبا جثہ، سفید مبارک ریش اور نورانی چہرہ۔ جس پر ایک نظر کر دیتے وہ انہی کا ہو جاتا۔ مگر کبھی اپنا آپ ظاہر نہ کیا۔ راجوں مہاراجوں کا دور تھا اور ہر موسم کا بویا بیجا ان کے ہرکارے آتے اور سمیٹ لے جاتے۔ پرنانا بھی اوروں کے ساتھ مشقتوں کا چرخہ گھماتے رہے، کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آنے دیا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ پردھان راجے کا کوئی عزیز بیمار پڑا اور ایسا روگ لگا کہ طبیبوں کے ٹھٹھ بھی کچھ کام

نہ آئے۔ کسی نے پرنانا کو خبر کی۔ فرمایا کہ اسے کھولے آئے میرے پاس۔ اللہ بھلی کرے گا۔ بیمار کو لایا گیا اور جب آنکھ سے آنکھ ملی تو وہ ایسا نکھر آیا کہ جیسے اسے کچھ تھا ہی نہیں۔ راجہ نیاز بجا لایا اور ایک بڑا رقبہ پرنانا کی نذر کیا۔ آج بھی وہ زمین وقف کے زمرے میں ہماری خاندانی وراثت کا حصہ ہے۔ ایک اور واقعہ بھی وہ اکثر سنایا کرتی تھیں اور وہ یہ کہ جاڑوں کے دن تھے، سورج چھپ چھپ نکلا کرتا تھا۔ رات بھر ایسا کہر پڑتا کہ خدا پناہ۔ پرنانا حسبِ معمول رات کے پچھلے پہروں عبادت میں مشغول تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عجیب و غریب بلا کہ جس کا ایک سرا زمین اور دوسرا آسمانوں میں ملتا دکھائی پڑتا ہے، گاؤں کی جانب مسلسل بڑھے چلی آتی ہے۔ قریب تھا کہ وہ سارے گاؤں کو روند ڈالتی، پرنانا آگے بڑھے اور اس کا بازو پکڑ کر زمینوں کے بیچوں بیچ نہر کنارے کھینچ لائے۔ کہتے ہیں جاتے جاتے اس بلا نے پرنانا سے کہا: میاں پھولیا! تُو نے اپنا گاؤں بچا لیا، تیری جگہ کوئی ہوتا تو میں اسے نابود کر کے رکھ دیتی۔ اگلے چند دنوں میں معلوم ہوا کہ پورب کے علاقوں میں کوئی زبردست وبا پھوٹ پڑی ہے اور سینکڑوں لوگ روزانہ مر رہے ہیں۔ پرنانا جی کی قبر انور آج بھی مرجع خلائق ہے۔ جب کسی پر سخت مصیبت آ پڑتی ہے تو وہ یہاں حاضری دیتا ہے، پھر اللہ اس کی مشکلیں آسان فرما دیتا ہے۔ میں نے بچپنے ہی سے جمعرات کی جمعرات ان کے دربار پر اپنے بڑوں کو دیا جلاتے دیکھا۔ میں بھی اکثر حاضر ہوتا اور جلتے دیئے کے اس پار کچھ تلاشنے کی آرزو میں پہروں بیٹھا رہتا۔ بیری کے جھنڈ تلے خاموش قبر تسبیحیں پڑھتی محسوس ہوتی اور میرا دل سنبھالے نہ سنبھلتا۔

بچپن کے دنوں ہی کی بات ہے، میں ماں جی کے پاس سویا کرتا تھا۔ وہ بھی رات گئے تک حقہ گڑگڑاتی تھیں اور نانا جی کے فوت ہونے کے بعد جب میں کہانی سنے بغیر سونے سے انکاری ہوتا تو وہ مجھے پکی روٹی گنگنا سناتیں، کبھی عہد نامہ اور کبھی نور نامہ اور بس کبھی کبھی قصہ سیف الملوک۔ پہلے پہل تو ان ٹوٹکوں سے مجھے نیند نہ آتی مگر پھر کچھ عادت سی ہو گئی۔

شعر سمجھ میں کب آتے، بس آجا کے ایک لے تھی جو رفتہ رفتہ کہیں سے خمار کھینچ لاتی اور میں گڑ گڑ کرتے حقے کے دھوئیں میں دھواں ہو جاتا۔ سرد راتوں میں ابا جی کی بُکل بھی میرا پنگوڑا بنتی تھی۔ خوب یاد ہے کہ جب وہ زانوؤں کے گرداگرد چادر لپیٹے چارپائی پر بیٹھ سورۃ یٰسین ورد کر رہے ہوتے، میں چھلانگ لگا ان کی گود میں جا گھستا۔ گرم گرم سینے سے لپٹ ان کا مسلسل تیز تر ہوتا جاپ سنتا اور پھر یوں ہی دبکے دبکے آنکھیں بوجھل ہو جاتیں۔ اندر ہی اندر لفظ ٹپکتے رہتے، لے گنگناتی پھرتی اور میں مسکراتے ہونٹوں گہری نیند سوتا چلا جاتا۔

جب پراسرار سرگوشی سنے اور بابے کی تلاش میں اپنی سی کوشش کیے مجھے مہینوں ہو چلے تو جی میں آئی کہ اپنے تئیں بات کو سینے میں داب رکھنا اور ہونق بنے پھرنا کچھ عقلمندی نہیں۔ ہو سکے تو کسی بڑے سے پوچھ لینا بہتر ہے۔ شاید کوئی سرا ملے یا کچھ تشفی کا سراغ چلے۔ یہ ارادہ کر کر میں اپنے ایک استاد کہ برسوں جس نے کھجور کے پتوں پر بیٹھے درس دیتے گزارے اور جو اپنے آپ میں خوب کامل تھا، کے پاس پہنچا اور سب کچھ گوش گزار کیا۔ وہ نور پتلا میری بات سن سن مسکرایا اور گویا ہوا، برخوردار! قربانی لگنے کو جانور کا صحیح سالم اور صحت مند ہونا شرط ہے۔ نقص والا از روئے شرع قربانی کے لائق نہیں۔ کچھ سمجھے؟ میں عرض گزار ہوا، حضور! اتنا ہی سمجھ والا ہوتا تو خدمت اقدس میں حاضر کاہے کو ہوتا۔ کچھ ایسا فرمایئے کہ بھس بھرے دماغ میں اترے اور تیر مانند ترازو ہو۔ فرمایا، برخوردار! نیک فال رکھتے ہو۔ منزل تیار کھڑی ہے مگر ذرا گھوم کے آؤ تو ملے۔ وہی نہر کنارہ کہ جو تیرے گاؤں کے قریب ہے اور درختوں کے اسی جھنڈ میں کہ جہاں تُو پہروں بیٹھتا ہے، بابا بیٹھا ملے گا۔ مگر ذرا گھوم کے آؤ تو ملے۔ میں نے کہا، حضور کدھر کو گھوموں۔ میں تو وہاں گھوم گھوم تھک چکا۔ آپ کچھ فرمایئے تو جانوں۔ کہنے لگے، میاں! دینو مزارع کا بیٹا اگر مزارع بن بیٹھ رہے تو کچھ کمال نہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ پردھان بننے کی ٹھان لے اور پھر بن دکھائے۔ یہ بھی کچھ ایسا کمال نہیں، اصل کمال تو اس کا تب بچے جب عین جوبن کے عالم میں جب سب اسے

پردھان مان جھک جھک جاویں، وہ اپنے باپ کا درانتی کھرپا سنبھال، زمینوں میں آ بیٹھے۔ سمجھے یا نہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو وہ گویا ہوئے۔ چل برخوردار اب جا۔ نیت صاف منزل آسان۔ اللہ بھلی کرے۔

......وہ عبارت حذف کردوں تو اچھا کہ جس کا اس کہانی میں دخول ذہنوں میں درد بن کر کلبلانے لگے۔ آوارگی کے برس ہا برس کہ جو میں نے قدم قدم جبر کی سیخوں پر چھدتے اور لمحہ لمحہ ہلکان ہوتے گزار دیئے۔ دائروں میں گھوم گھوم اپنے آپ کو دھند وادیوں میں اتنا دور تک اس بے دردی سے اچھال دیا کہ واپسی کا سفر وہم لگنے لگا۔ خالی کھوپڑیوں اور ادھڑی ہوئی انتڑیوں کی مصاحبت...... فقط اس لیے کہ کچی مٹی جب تک تند تھپیڑوں کے ساتھ گوندھی نہ جائے ٹھیکر نہیں بنتی۔ لکھوں تو لفظ چیخ چیخ اٹھیں، بولوں تو زبان کڑکڑا جائے۔ سو بہتر ہے کہ اندھی یادوں کا حرف حرف بن لکھا، بن کہا ہی رہے۔ بے خبر ساعتوں کی ہوا چلے تو کیا، نہ چلے تو کیا......

برس ہا برس بعد کہ جب میں گونگے کمال کو چھو نہر کنارے پلٹا تو یخ بستگی کے ہاتھوں چُور چُور رات کا پچھلا پہر تھا۔ اندھیروں کی خرخراہٹ گھمبیر ہوتے ہوتے وحشت کی آخری حدوں کو جا پہنچی تھی اور درختوں کا وہ جھنڈ کہ جہاں میں سہانے وقتوں میں پہروں بیٹھا کرتا تھا۔ اپنا سینہ کھول آج بھی میرا منتظر تھا۔ میری آنکھیں ابل پڑیں۔ کاٹ دار ہواؤں کی جگہ نرم لچکیلے سکون آور جھونکوں نے لے لی اور میں بے دھڑک دھیرے دھیرے چلتا اپنی چوکی پر آ بیٹھا۔ نہر کنارے درختوں کے جھنڈ تلے حقے کی گڑگڑاہٹ، بہتے پانیوں کا شور اور بابا...... پچکے گال، چوڑا ماتھا، سانولا رنگ اور نشیلی بادام آنکھیں۔ بڑھاپے کی کوئی سی نشانی بھی تو ہویدا نہ تھی۔ نہ بال سفید، نہ جھریوں بھرا چہرہ، نہ رعشہ زدہ بدن۔ مگر میں...... قریب ہی کہیں سرگوشی ابھری۔ آواز کھنکھناتی ہوئی کانوں میں اتری اور نقش ہو گئی۔ کہنے والے نے کہا، مبارک قبول کر بابالوکا...... تو بھی خوب پہنچا...... اصل کمال تو اب جچا ہے۔

بن لفظوں کے کہا سُنا

رات بھر گھوڑے سرپٹ بھاگتے رہے۔ درجنوں کے حساب سے اچانک ہی نمودار ہوئے تھے۔ دگڑ دگڑ کرتے پاس سے گزرے تو اس نے چاہا کہ میں بھی ان کے ساتھ بھاگوں۔ بجلی کی سی تیزی سے ایک گھوڑا اس کے پاس آ رُکا اور اگلے ہی لمحے اسے اپنی ننگی پیٹھ پر لیے ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ٹھنڈی میٹھی نرم دودھیا چاندنی رات میں لوہے کی طرح سخت لشکیلے گھوڑے کی پیٹھ پر وہ بیٹھا ہچکولے کھاتا رہا۔ نہ کوئی باگ تھی نہ رکاب، مگر وہ گرا نہیں۔ گھوڑے کے گرم جسم سے گھٹنوں چپکا رہ کر خود بھی انگارہ بننے لگا۔ رات بھر انگارے دہکتے رہے۔ جان توڑ کر بھاگتے رہے۔ کوئی منزل تھی نہ رستہ۔ بس دھول اڑتی رہی، ہنہناہٹیں گونجتی رہیں، کوندے لپکتے رہے اور صبح ہوگئی۔ گھوڑے غائب تھے مگر جسم عرق عرق۔ اک آگ سی رُواں رُواں میں چابک مار رہی تھی۔ جسم کا نرم تر حصہ بھی تن کر لوہا بن چکا تھا۔ چھوا تو یوں لگا۔ جیسے آتش فشاں پھوٹا پڑا ہے اور چپکتا گرم لاوہ مسلسل پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

ہفتہ بھر پہلے بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ خوب ڈر سا لگا تھا۔ کچھ شرمندگی اور ندامت سی بھی ہوئی اور اسی لیے دن بھر وہ اپنے کمرے ہی میں گھسا رہا۔ لیکن اندر ہی اندر ایک عجب سی لذت بھی تھی، کچھ نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ رگوں میں دوڑتا خون ہلکی ہلکی تپش دیے

لگا تھا اور جب اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو گالوں سے سرخی چھلکی پڑتی تھی۔ وہ جھینپ سا گیا۔ کسی سے کچھ کہا نہ سنا۔ بس اپنی سمجھ کے مطابق نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے اور سر درد کا بہانہ کر کے بستر میں گھس گیا۔ ذہن میں عجب اوٹ پٹانگ سی ہوتی رہی۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ بھول کر بس یہی کچھ سوچتا رہے لیکن شرمندگی کا احساس بار بار رکاوٹ بن رہا تھا۔ اگلی کئی راتیں عافیت سے گزر گئیں۔ کبھی کبھار گھوڑے سرپٹ بھاگتے نظر آتے۔ کبھی چمکیلے جسموں والے سانپ پھنکارتے پھرتے اور کبھی بے شمار مچھلیاں اس کے اردگرد تیرنے لگتیں۔ وہ انہیں پکڑنے کی کوشش کرتا تو ہاتھوں میں پھسل پھسل جاتیں۔ صبح اٹھتا تو جسم میں انگارے بھرے ہوتے لیکن ایسا کچھ نہ ہوتا کہ اسے دن بھر کمرے میں گھسے رہنا پڑتا۔ لیکن آج کچھ ایسا ہو گیا تھا۔

ہفتے بھر کے بعد آج پھر وہ چپ چاپ نہا دھو کر اپنے کمرے میں گھسا رہا۔ باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ عجب سی سوچیں سارا دن دندناتی رہیں مگر پہلے کی نسبت خوف بہت کم تھا اور کیف و سرشاری زیادہ۔ بار بار مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل جاتی، آنکھوں میں شوخی سی اتر آتی اور وہ تپتے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے سہلانے لگتا۔ جی چاہتا تھا کہ گنگنائے، کوئی میٹھا سریلا راگ الاپے۔ سو تکیے کو بانہوں میں دبوچے وہ دیر تک ہولے ہولے گنگناتا رہا، رہ رہ کے مسکراتا رہا اور آنکھوں میں شرارت سی ناچتی رہی۔

نہیں معلوم پڑوس والی آنٹی کی بیٹی پر کیا بیت رہی تھی لیکن کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں شوخی چوگنی ہو گئی ہے۔ گالوں پر سرخ سرخ لہریے تو پہلے بھی تھے مگر اب انگاروں کی طرح دہکنے لگے ہیں۔ عجب آڑی ترچھی حرکتیں کرنے لگی ہے۔ یوں تن کر چلتی ہے کہ گویا سارے جہان کا لوہا اسی کے سینے میں آ جما ہے۔ وہ بھی ذرا تن کر چلنے لگا۔ ذرا کندھے ہلا کر اس کے سامنے سے کھنکار کے گزرتا۔ گھور کے دیکھتا اور وہ بھی بلا کی ڈھیٹ کہ ذرا نہ لجاتی۔ ٹکٹکی باندھے پلکیں مٹکاتی رہتی اور پھر ایک پیاری سی مسکراہٹ پر بن

لفظوں کے کہا سنا مکمل ہو جاتا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اب یہ کیا طوفان امڈ پڑا ہے۔ دونوں طرف یہی سوال بار بار اٹھتا اور دب جاتا۔ اک ہلکی سی مسکراہٹ، اک ہولی سی شرارت بھری سرخی اور اک مدھر سی سنسناہٹ رگوں میں میٹھا سا ارتعاش پیدا کرتی گزر جاتی اور پھر دونوں طرف تکیہ بانہوں میں دبوچ کر گنگنانے کی آرزو مچل اٹھتی۔ سب سوالوں کا جواب اک بھیگی بھیگی مدھر تان۔

وہ سب کا چہیتا تھا مگر بڑے میاں جی سے اس کی خاصی بنتی تھی۔ میاں جی سب کے لیے میاں جی تھے لیکن اس کے جگری یار۔ کئی ہفتوں سے جاری اس کھیل تماشے کی حقیقت میاں جی ہی بتا سکتے ہیں۔ اس نے سوچا اور میاں جی کے پاس لحاف میں جا گھسا۔ میاں جی میاں جی! ایک بات تو بتائیں، آپ کو خواب آتے ہیں؟ آتے ہیں تو کیسے ہوتے ہیں اور اگر نہیں آتے تو کیوں؟ میاں جی نے جواب کی بجائے الٹا سوال داغ دیا۔ اوئے شریر! پہلے تُو بتا، تجھے آتے ہیں؟ آتے ہیں تو کیسے؟ نہیں آتے تو کیوں؟ ہنسی مذاق چلتا رہا جس کے بیچوں بیچ میاں جی نے اپنے خواب سنائے۔ نورانی بزرگ ہستیوں کے قصے جن کی زیارت سے وہ خواب میں فیض یاب ہوئے، بابرکت جگہوں کی سیر اور ٹھنڈے میٹھے چشموں والی جنت۔ جب وہ سنا چکے تو اس نے اپنے گھوڑوں، سانپوں اور مچھلیوں کی عجیب وغریب کہانیاں سنائیں مگر آتش فشاں اور لاوے کا قصہ گول کر گیا۔ میاں جی نے ایک ہی حل نکالا کہ رات سونے سے پہلے چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ لیا کر اور ایک گلاس پانی پر الحمد شریف دم کر کے پی لیا کر۔ خوابوں میں سے شیطان کا سایہ اٹھ جائے گا۔

ادھر پڑوس میں دادی اماں نے بھی یہی کچھ کہا۔ بس اضافہ اتنا کیا کہ سر کو چادر سے ڈھانک کر سویا کر۔ لڑکیاں ننگے سر سوئیں تو بدروحیں تنگ کرتی ہیں اور پھر ذہن اوٹ پٹانگ سوچنے لگتا ہے۔ سو اس رات سر ڈھانپنے والی نے سر ڈھانپا اور ورد کر کے سو گئی۔ میاں جی کے پاس سے اٹھنے والے نے بھی دم کر کے پانی پیا اور ورد کر کے سو گیا۔ رات خاموشی سے

گزر گئی۔ بدروحوں نے تنگ کیا نہ گھوڑے دوڑے اور نہ کچھ اور۔ صبح جسم بھی برف کی سِل تھا۔ حیرت کی بات کہ دن کو گلی میں سے گزرتے ہوئے دونوں نظریں بچا کے گزر گئے۔ کنکھیوں سے دیکھا اور بس۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا لوہا پگھل کر پانی ہوگیا ہے۔

اگلے کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ اسے پختہ یقین ہونے لگا کہ میاں جی کا بتایا ہوا عمل مجرب ہے۔ سو وہ ہر رات یہی عمل دوہراتا اور اپنے تئیں مطمئن ہو ہو رہتا۔ مگر دل ہی دل میں عجب خلش سی تھی جو بے قرار رکھتی۔ بار بار سوچا کہ عمل ترک کر دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ میٹھی میٹھی شوخی اور گرم تپتپاتے گالوں کو ہاتھوں سے سہلانے کی خواہش جنم لیتی اور دب جاتی۔ برف سے جسم میں مدھر سی کوئی لہر سنسناتی، ذرا سا ارتعاش پیدا کرتی اور گم ہو جاتی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے آپ کو بغور دیکھا کرتا۔ آنکھوں میں شوخی لانے کی کوشش کرتا مگر بے سود۔ سوئی سوئی سی پلکوں کے اس پار کچھ نہ کچھ پھٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔ کوئی انگڑائی، کوئی ترنگ، کوئی مدھر سی تان کہ جو آگ لگا دے۔ انگارے دہک اٹھیں۔ برف کی سِلیں اچھی مگر دہکتے انگاروں کا اپنا ہی مزہ ہے۔

رات وہ حسبِ معمول ورد کر کے اور دم کیا ہوا پانی پی کر سو گیا۔ نیند کی سنہری وادیوں میں ندی نالوں کے کنارے کنارے پہروں گھوما کیا اور روش روش ہمکتے پھولوں پر نظر کرتے آگے بڑھتا رہا۔ ہر طرف خوشبوئیں تھیں، تتلیاں اور رنگ ہی رنگ۔ اچانک کیا دیکھتا ہے کہ یکلخت ایک بھونچال سا آیا اور سارا منظر الٹ کے رہ گیا۔ سرپٹ بھاگتے گھوڑے کہیں سے نمودار ہوئے اور پھر ہر طرف بس ان کے ٹاپوں کی گونج تھی۔ دل میں خواہش ہوئی کہ وہ بھی ان جیسا ہو جائے، سو ایک گھوڑے پر وہ سوار ہوا اور ننگی پیٹھ پر بیٹھا انگاروں کے ساتھ انگارہ بنتا چلا گیا۔ رات بھر انگارے دوڑتے بھاگتے اور ہنہناتے رہے۔ نہ کوئی منزل نہ رستہ۔ صبح ہوئی تو گھوڑے غائب تھے مگر جسم کا رواں رواں آگ۔ لاوہ پھیل رہا تھا۔ عجب سرشاری رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ آئینے میں دیکھا تو گال تمتمار ہے تھے اور آنکھوں میں رنگ

برنگے پھولوں کی قطاریں۔ حیرت کی بات کہ دن کو گلی میں پڑوس والی بھی تن کر کھڑی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے پانی پانی ہوتا لوہا پھر سے اس کے سینے میں آ جما ہے۔ دونوں ہولے سے مسکرائے، آنکھوں میں شوخی کا کوندا لہرایا اور ایک جگمگاہٹ سی گلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلتی چلی گئی۔

اُکڑوں بیٹھا وقت

مجھے جُز سے نہیں کُل سے غرض ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں! اپنا آپ سامنے پھیلے ہاتھ کی لکیروں کی طرح سب کا سب میری نظر کے دائروں میں دے مارو۔ تشفّی کی سیپ کے بند کھل جائیں گے۔ پھر میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ خداوند خدا کی قسم...... یہ مت کہنا کہ پہلے تم۔ فیصلہ کر دو، بس حکم سنا دو، پھر جو ہوگا یکبارگی۔ کیا تم، کیا میں۔ سنتے ہو میں نے کیا کہا؟؟...... چپ کا زناٹا ہوا میں لہرایا اور گم ہوگیا۔ سامنے پڑی چائے کی دوسری پیالی کے اس پار کا ہیولا کوندے کی طرح لپکا اور ہال کے صدر دروازے سے یہ جا وہ جا۔ اب وہ اکیلا تھا۔ اپنے آپ کو چائے کے آخری گھونٹ میں اچھی طرح گھول کر حلق میں انڈیلتے ہوئے اس نے سوچا؛ یقیناً جُز، جُز ہے اور کُل، کُل۔

دوسرے دن فلسفے کے لیکچر میں وہ پھر ساتھ ساتھ تھے۔ پروفیسر نے نصابی گفتگو کے بعد وائٹ بورڈ کے درمیان مار کر سے نقطہ ڈالا اور اوپر سوالیہ نشان کی ٹک بنا دی۔ یہ آج کے لیکچر کا اختتامیہ ہے۔ ہمارا پہلا اور آخری مسئلہ بس یہی ایک منحنی سا نشان۔ ہم اس نشان کو پاٹنے میں لحہ لحہ گھلتے ہیں۔ پاٹ چکتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہم نے کچھ کسر باقی رکھ چھوڑی۔ سو ہم کھوجتے ہیں، پاٹتے ہیں، تھک کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں مگر ازلوں کی رہی کسر ہمیں ہٹنے نہیں دیتی۔ ہم سب اس منحنی صورت والے بُھتنے کی قید میں ہیں۔ ہم جُز جُز

کریدنے کے سوااور کچھ نہیں کرتے۔ کیا آپ میری اس بات سے متفق ہیں؟ آئندہ لیکچر میں اس حوالے سے آپ کے خیالات جاننے کا مجھے اشتیاق رہے گا۔ پیریڈ ختم ہوا تو وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔

جم میں ورزش سے پہلے وارم اپ ہونے کے لیے دو ہیولے اچھل رہے تھے۔ باقیوں سے زیادہ خوبصورت، زیادہ چاق و چوبند اور زیادہ توانا۔ پھول پنکھڑیوں سے رنگ اور رس ٹپکاتی بھر پور جوانی۔ شارٹ ڈریس پہنے وہ ورزش کرتے رہے اور کنکھیوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مسلسل تنتے نرم ہوتے مسلز میں سورج کا سا جوبن لہریے کھا رہا تھا۔ چہروں پر سرخی انڈی پڑی تھی اور عرق عرق ہوتے وجود کا رُواں رُواں گویا تھپیڑے مارتا محسوس ہوتا تھا۔ آج رات کھانا اکٹھے کھائیں گے، ٹھیک ہے؟ دوسری طرف ذرا دیر کو چپ اور پھر......او کے، ٹھیک ہے۔

بات سنو تو سناؤں؟ رات ملاقات پر ایک، دوسرے سے گویا ہوا۔ ہاں سناؤ۔ دل کی ورق ورق کتاب پر لکھا ہے کہ وجود کی بھوک لمس کی حدت ہے۔ وجود کو وجود سے مس کرو تو کچھ ہونے کا احساس ہمکتا ہے۔ حاصل اس کا لذت ہے، تشفی ہے۔ اخلاق، ضابطے، قانون سب ہیچ ہیں۔ اندر کی آواز دھرم ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بیج کے اندر بالا۔ موجود ہوتا ہے مگر دکھائی نہیں پڑتا۔ بیج اس کی پکار سن لے، اس کے لیے اپنا سینہ کھول دے تو دھرتی ایک نئی شے سے آشنا ہو جاتی ہے۔ پکار اندر ہی گھٹ جائے تو سڑانڈ بن جاتی ہے......تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟؟......ہاں ہاں، بولو......سنو! میرے اور تمہارے وجود میں، جب سے ہم شناسا ہوئے ہیں، اندر کی آواز ایک ہے۔ اسے سڑانڈ مت بننے دو۔ لمس کی حدت سے لذت کی پنکھڑیاں کھلا دینا اب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آؤ فیصلے کے اضطراب سے ہاتھ کھینچ کر اندر دھرم کے اندھے دھندلکوں میں کود جائیں۔

دوسرے نے کندھے اچکائے اور بولا، اے مجھ جیسے! جو تُو سوچ رہا ہے وہی میں سوچ

رہا ہوں لیکن...... لیکن ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ تُو تو جانتا ہی ہے کہ ہمارا سماج...... مذہب...... اچھا چھوڑ و اس ٹاپک کو، بتاؤ کھانے میں کیا لوگے۔ فرائیڈ مٹن...... مختصر جواب ملا اور اس کے بعد کھانے کے دوران دونوں مسلسل چپ رہے۔ سکوت ایک پر دابے دیر تک اپنے اصیل ہونے کا ناٹک کرتا رہا کہ اچانک پہلے نے اس کے سر پر آواز کا مُکا مارا...... مجھے تمہارے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا ڈئیر۔ میں دیکھتا ہوں، سنتا ہوں، بولتا ہوں، ہر بات کی گہرائیوں میں اتر کر کھرچ لینے کی صلاحیت رکھتا ہوں لیکن ہر طرف تم ہی تم ہو۔ جذب کی آخری حدوں کی قسم؛ 'آئی لو یو۔ آئی رئیلی لو یو اینڈ مس یو اِیور' کیا کہتے ہو تم۔ پلیز کچھ بولو کہ قرار ملے۔ 'سیم ٹو یو'۔ ایک جملے میں گویا کہنے والے نے پوری کائنات سمیٹ دی۔ مسکراہٹوں نے دھمال ڈالی اور دونوں کے بیچ اکڑوں بیٹھ سلامی لی۔ کھانے کے بعد پہلے ایک ہیولا تحلیل ہوا اور پھر دوسرا۔ بڑے ہال میں موجود فانوس نے ادھر ادھر جھانک کر دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

سر ہمارا سب سے بڑا مسئلہ سوال نہیں، سوچ ہے۔ ہم سوچتے ہیں تو الجھ جاتے ہیں۔ الجھ جاتے ہیں تو سوال کی بیساکھی سے اپنا آپ سہارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یقیناً میرے ساتھی اس کی تائید کریں گے۔ ایک نے کلاس میں بحث کا آغاز کیا اور آنکھ دباتے ہوئے پاس بیٹھے دوسرے کو دیکھا۔ باقی سب ادھر متوجہ ہو گئے۔ جی سر میں اس کی تائید کرتا ہوں اور اضافہ یہ کہ ہم اجزا کو اپنے اوپر اس طور پر اوڑھا لیتے ہیں کہ کُل کا عمل ساکت ہو جاتا ہے۔ کُل کیا ہے؟ نیچر...... نیچر سوچتی نہیں، اپنے آپ کو محسوس کرتی ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عمل میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ ہم نیچر کا حصہ ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو محسوس کریں تو یقیناً ہماری روانی میں خلل واقع نہ ہوگا۔ اندر کی آواز دھرم ہے۔ باقی سب پیچ ہے۔ بحث اس کے بعد بہت دیر تک جاری رہی لیکن وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔

...... بہار موسم میں شام سہانے سمے، جنگل پرندوں کے جھرمٹ میں بیٹھا چہک رہا

تھا۔ درختوں کے بیچوں بیچ کھدے رستے پر دو ہیولے رواں دواں تھے۔ محوِ گفتگو۔ خراماں خراماں۔ بڑھے چلے جا رہے تھے۔ نیچرا چک لیتی ہے، فعلیت کی تمام حسیں بیدار کر دیتی ہے، اپنے گھماؤ میں لا کر ہر شے پر جذب کی چاشنی کا روغن ڈال دیتی ہے...... آؤ ڈیئر ذرا پل یہاں بیٹھتے ہیں...... خمار کے اندر خمار ہونے کو سوچ کے کتے کو دھتکار دو۔ میرے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھ دو کہ بے قراری کی چھاگل چھلکی پڑی ہے۔ آؤ فطرت کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بھولپن کا جھولا جھولو۔ رس نچڑنے دو، اتنا کہ پیاس کے کٹورے لبالب بھر جائیں۔ قریب آؤ یوں کہ جیسے پھول کے ماتھے پر شبنم نقش ہو جائے...... پہلی بار ہونٹوں نے ہونٹوں کو چھوا تو سارے جنگل کو گویا آگ لگ گئی۔ لذت بل کھا کھا ہلکان ہوئی جاتی تھی مگر دونوں نے تند گھماؤ کی بے بہرہ فعلیت کو کہیں دور ٹھہرائے رکھا۔ بس پاکیزہ لمس کی مہک تھی اور وہ۔

برسوں پہلے کسی نے کہا تھا کہ زندگی چپکنے والی غلاظت ہے جو بہتے بہتے جم گئی ہے۔ غلاظت کو غلیظ تر کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ عورت کا ہے۔ دنیا میں اگر کوئی قابل نفرت شے ہے تو وہ ہے عورت۔ دونوں کو وہ شخص پسند تھا۔ کیا خوب بات کتنی خوبی سے کہہ گیا۔ گھنٹوں نخشتے وہ اکثر اس کو موضوع بناتے لیکن اس کی منحنی صورت...... دونوں کو قے سی آ جاتی۔ ڈیئر اس نے عورت کو خوب لتاڑا ہے بس یہی اس کا احسان کافی ہے، باقی سب باتوں کو چھوڑ دو...... حرام زادیاں کہیں کی۔ اور یہ...... یہ سماج اور مذہب کی طوائفیں!! کیا کہوں میں ان کو۔ کاش کوئی ان کو بھی جذب کی آخری حد تک جا روندے...... ہاں ہاں روندا ہے، بہت سوں نے روندا ہے لیکن ڈیئر اب کوئی بُلھا تو آنے سے رہا...... لیکن شاید ہم...... ہاں ہم روندیں گے۔ جذب کی آخری حد تک جا روندیں گے۔ بس ہمیں فیصلہ کرنا ہے، حکم سنانا ہے، اپنا آپ ایک دوسرے کو سونپنا ہے۔ تو کیا تم تیار ہو؟ ؟ نو نو ڈیئر پلیز جلدی نہ کرو۔ آئی ہیو سم کنفیوژن سٹِل نَو۔

کنفیوژن! اف کنفیوژن۔ یہ تمہاری خرابی نہیں، یہ سب اس دور کا ابتلا ہے۔ لیکن شاید دور تو سب ایک سے ہوتے ہیں اور کنفیوژنز بھی ایک سی۔ پھر میں اسے کیا نام دوں۔ میں اپنے اور تمہارے اندر کی آواز کو بھی تو کوئی نام نہیں دے سکتا۔ نام تو بس طفل تسلیاں ہیں۔ شاید تمہارا ذہن فطری اور غیر فطری کی گتھی میں الجھا پڑا ہے۔ عورت کا عورت سے تعلق، مرد کا مرد سے تعلق اور مرد اور عورت کا تعلق...... سب وجود کی بھوک ہے۔ ناموں کے گھماؤ سے ذرا نکل کر دیکھو تو سہی۔ تم یہاں مذہب کا نام میرے سامنے مت لینا۔ مذہب کی حیثیت میرے نزدیک اس لونڈیا سے زیادہ کچھ نہیں جس پر جو ہاتھ رکھ دے وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ فطرت، تشفی کا عمل ہے۔ جیسے بھی ملے، جہاں سے ملے، اچک لو۔ یہی تشفی ہے، یہی فطرت ہے۔

آخری رات سے ایک دن پہلے کالج لان میں وہ بیٹھے ڈر اور خوف کو موضوع بنائے ہوئے تھے۔ یار جو تم چاہتے ہو وہ میں بھی چاہتا ہوں لیکن...... لیکن مجھے خوف آ رہا ہے۔ تم نے سنا تو ہوگا قصہ ان لوگوں کا جو دھتکارے گئے۔ آسمان سے پتھر برسے اور پھر ان میں سے ایک بھی باقی نہ بچا، یا ان کا کہ جنہیں چنگھاڑ نے آ گھیرا اور پھر جو جہاں تھا وہیں جم کے رہ گیا۔ خوف کی چادر تلے جذب کی آخری حد تک جانا محال ہے۔ کچھ ایسا کہو کہ تشفی ہو...... دوسرے نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ یار بودے نہ بنو۔ یہ سب واہمے ہیں۔ جُز جُز میں بٹ جانے اور بکھر کر رہ جانے والوں کے واہمے۔ ہم ایک بڑے کُل کا حصہ ہیں۔ جو سب کے ساتھ ہونا ہے وہی ہمارے ساتھ بھی ہوگا۔ یہ تو اٹل ہے کہ ہم نے ہمیشہ کو یہاں اسی حالت میں نہیں رہنا۔ کوئی چیں کرے یا میں۔ تو پھر بھاڑ میں جائے یہ خوف۔ سِسک سِسک کر مرنے سے بہتر ہے کہ اپنی مرضی جیو اور سینہ تان چل بسو۔ زندگی کون سی ہمارے باوا کی جاگیر ہے۔ یا ہم نے اپنی کمائی سے ذرہ ذرہ جمع کی ہے۔ جس چیز میں ذرا پل سکون ملے، اچک لو۔ اٹھو چلیں۔

جسم میں دونوں کے درمیان اس دن مستی ڈولتی رہی۔ آج ادھر خوب دل لگ رہا تھا۔ ایک نئی طرز کا احساس ابلا پڑا تھا۔ یار ذرا ٹونی کو دیکھو...... ایک نے سرگوشی کی۔ دوسرا مسکرایا۔ ہاں اچھا ہے مگر تم سے اچھا نہیں۔ سنا ہے جیکی کے ساتھ اس کی بڑی لگتی ہے۔ کوئی...... دونوں کھکھلا اٹھے۔ بھئی تم ٹونی اور جیکی کی بات کرتے ہو یہاں تو سارا شہر پٹا پڑا ہے۔ ایک سے ایک ٹونی، ایک سے ایک جیکی کو دبوچے بیٹھا ہے۔ شیدے مکینک سے مولوی مستان تک، چاچے نانبائی سے پروفیسر ذاکر تک۔ کس کس کا نام گنواؤں۔ بس آج ہم بھی فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ کہو کیا کہتے ہو! ٹھیک ہے، بلکہ بہت ہی ٹھیک۔ دونوں کی باچھیں کھل اٹھیں۔ شام کو بازار چلیں گے، کچھ ضروری چیزیں خریدنی ہیں۔ رات تم ہوسٹل نہیں جاؤ گے، میرے ساتھ گھر چلو گے، سمجھے؟...... بالکل۔ کوئی اور حکم! نہیں نہیں کچھ نہیں، بس ذرا سوچ کو گرہ لگا کر ادھر جسم ہی میں ڈال جانا۔

رات دونوں نے لمس کی حدت تلے پھیلی ملگجی روشنی میں اکڑوں بیٹھے گزار دی۔ سامنے پھیلے ہاتھ کی طرح دونوں نے اپنا آپ ایک دوسرے کی نظر کے دائروں میں دے مارا۔ لذت اچھل اچھل اپنا رس نچوڑتی رہی اور دونوں اس کے دائروں میں گم ہلکورے کھاتے رہے۔ سب کچھ یکبارگی ہوا۔ وقت قریب ہو ہو داد دیتا رہا۔ تشفی کی سیپ کے سارے بند کھل گئے...... صبح دم گل سے واپس پلٹتے ہوئے جُز جُز بکھرے واہموں پر دونوں نے نظر کی تو وہ جوں کے توں تھے۔ گمان گزرا کہ اب پتھر برسیں گے یا کہیں سے کوئی چنگھاڑ انہیں آگھیرے گی۔ سو وہ سینہ تانے منتظر رہے۔ مگر عجب تھا کہ نہ کوئی چنگھاڑ ابھری اور نہ کہیں سے پتھر برسے۔

مُندری

شہر سے ذرا باہر ایک جھونپڑی بنی تھی۔ جھونپڑی کیا تھی، چار لکڑیاں گاڑ کر اوپر گھاس پھونس ڈال دیا گیا تھا۔ چماروں کا کنبہ تھا۔ بوڑھا ماجھا، اس کا بیٹا سونا اور ایک لڑکی مُندری۔ ماجھے کی عمر ستّر کے لگ بھگ تھی...... ٹی بی کا مریض، سیاہ کالا رنگ، سوکھا سڑا جسم، پچکے بے نور چہرے پر بھوک اور بیماری کی پرچھائیاں ہویدا...... رات دن ایک کونے میں ایک میلا چیکٹ کمبل اوڑھے پڑا کھانستا رہتا۔ آس پاس جگہ جگہ تھوک اور بلغم کی پپڑیاں جن پر مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ سونا پچیس کا ہوگا، لمبا تڑنگا مگر پتلا سکڑا اور روکھا پھیکا۔ رنگت میں اپنے باپ ماجھے سے بھی گیا گزرا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، لمبی ناک، پتلی سی مونچھیں، کائی کی طرح کے بے ڈھنگے بال، کچھ کام ملتا تو کر لیتا ورنہ دن بھر آوارہ پھرتا اور رات کو آ کر ایک طرف پڑ رہتا۔ مُندری سونے ہی کی عمر کی چھوٹے قد اور دوہرے بدن کی عورت تھی۔

کئی برس پہلے جب ماجھا دھندے پر جاتا تھا تو کسی ڈھیر سے ترس کھا کے اٹھا لایا تھا۔ تبھی سے یہاں تھی۔ کچھ مانگ تانگ لاتی اور کھا پی لیتی، بچ رہتا تو بوڑھے اور سونے کو بھی دے دیتی۔ تینوں کی زندگی عرصے سے یوں ہی گزر رہی تھی۔ بوڑھا ماجھا تو اب بہت ساری فکروں سے آزاد ہو چکا تھا۔ بس فرشتۂ اجل کے انتظار میں زندگی کے دن پورے کر

رہا تھا۔ لیکن مُندری اور سونے کے دل میں کبھی کبھی اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی آرزو سر اُٹھاتی۔ وہ اکٹھے بیٹھ کر اکثر سوچتے لیکن کچھ بن نہ پڑتا۔ کرتے بھی تو آخر کیا۔ کوئی ڈھنگ کا کام انہیں آتا ہی کب تھا اور اگر آتا بھی ہوتو کوئی بھلا انہیں کام پر کیونکر لگانے لگے...... چمار جو ہوئے؛ پلید، پاپی، گندے...... آج وہ دونوں اکٹھے بیٹھے تھے مُندری سائیں بابا کے مزار سے تھیلا بھروا کر سلونے چاولوں کا لائی تھی۔ ماجھے کو تھوڑے سے دے کر باقی وہ دونوں کھا رہے تھے۔ یوں جیسے بھو کے گدھ۔ سونا کہہ رہا تھا واہ مُندری واہ آج مَجہ آ گیا۔ تو واقعی بڑی سندر ہے۔ کل ابا کہہ رہا تھا کہ میں تم سے بیاہ کرلوں۔ تو راجی ہے ناں مُندری! مُندری چہک اٹھی، ابے جو ماجھے کی مرجی وہی اپن کی مرجی...... پھر دونوں کا بیاہ بھی ہو گیا۔ بیاہ کیا تھا بس ایک دن ماجھے نے مُندری کا ہاتھ پکڑا اور سونے کے ہاتھ میں دے دیا۔ بس اللہ اللہ۔ نہ مولوی آیا، نہ لوگ جمع ہوئے، نہ کپڑے بنے، نہ کھانے پکے۔ کئی کئی دن فاقوں رہنے والے چمار بھلا یہ سب کیونکر کر سکتے تھے۔ شادی کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ماجھا چل بسا۔ کفن دفن کے لیے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ دن بڑی مشکل سے گزرا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوا تو دونوں اسے چپکے سے اٹھا پاس والے قبرستان میں دبا آئے۔ اب دونوں جھونپڑی میں گم صم بیٹھے اندھیرے میں گھور رہے تھے۔ مُندری کو رونا آ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کے روئے، عجب وحشت سی ہو رہی تھی، ساری جھونپڑی سُونی سُونی سی لگ رہی تھی۔ ماجھا تھا تو چلو کھانستا تو تھا، زور سے آئے وائے تو کرتا تھا، اس کی سانسوں کی آواز تو آتی تھی۔ اب وہ نہیں تو کتنی بے رونقی ہے۔ ہائے اللہ اس نے مجھے پالا پوسا لیکن میں اسے کچھ بھی نہ دے سکی۔ اس کا کفن تک نہ بن سکا۔ کچھ اسی طرح کے خیالات سونے کے بھی تھے۔ کیا ہمارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ ہم بھی یونہی کھپ مریں گے۔ کیا ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔ نہ نہ ایسا نہیں ہونا چاہیے...... پھر دونوں نے مل کر عہد کیا کہ وہ کام کریں گے، محنت کریں گے

اور پیسے کمائیں گے...... کام بھی سوجھ گیا، پورا منصوبہ ترتیب پا گیا، کل سے کام شروع۔ کل سے ہم شہر سے کوڑا اکٹھا کر کے یہاں لائیں گے۔ بلدیہ والے دس روپے فی من کے حساب سے خرید رہے ہیں تاکہ بھنگیوں کو رغبت ہو اور وہ شہر کی صفائی صحیح طور پر کریں......
پھر اگلے دن سے کام شروع بھی ہو گیا۔ دونوں صبح نکلتے اور شام تک شہر کی سڑکوں اور گلیوں سے کوڑا اٹھا اٹھا ایک جگہ ڈھیر لگاتے جاتے۔ خوب ڈھیر لگ چکتا تو بلدیہ والوں کا ٹرک آتا، وزن ہوتا اور پھر ایک نئے ڈھیر کے لیے کام شروع ہو جاتا۔ اب ہر ہفتے سونے کی جیب میں ایک لال نوٹ آنے لگا۔ وہ ان نوٹوں کو سنبھال کر رکھتے جاتے۔ اکثر گوڑے سے کھانے پینے کی اشیا چھانٹ کر پیٹ بھر لیتے اور اگر کچھ نہ بھی ملتا تو سائیں بابا کے مزار سے چاولوں کا لفافہ بھروا لیتے۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ ایک دن جب وہ گوڑا اکٹھا کر رہے تھے تو مُندری چکرا سی گئی۔ سونا قریب نہ ہوتا تو شاید گر جاتی۔ سونا پوچھ رہا تھا۔ اری مُندری تجھے کا ہوا رے!! وہ بولی سونے مجھے گھر لے چل۔ میرے پیٹ میں کچھ ہووت ہے، سر گھومے ہے...... اتنے میں اسے زور کی قے ہوئی۔ سونا اسے فوراً گھر لے گیا۔ پانی پلایا، سر دبایا لیکن وہ رات بھر تڑپتی رہی، آئے وائے کرتی رہی۔ صبح ہوتے ہی سونا اسے قریبی ہسپتال لے گیا۔ کسی نے اسے منہ نہ لگایا۔ کافی دیر وہ مُندری کو لیے ہسپتال کے برآمدے میں بیٹھا رہا۔ مُندری کی کراہیں دل دہلا رہی تھیں۔ بہت منت سماجت بعد چپراسی نے اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے دیا۔ مُندری کو فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے دوائیوں کی ایک لسٹ اسے دی گئی، وہ دوائیاں لینے گیا تو پورے آٹھ مہینوں کی کمائی ایک پل میں ہوا ہو گئی۔ مُندری درد سے بلبلا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی، سونے! میں نہ بچوں ہوں، میری جندگی اب بس ہے اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کی آہیں، کراہیں اور چیخیں دم توڑ گئیں۔ اب اسے آپریشن کی ضرورت نہ تھی۔ وہ چپ چاپ اسے کندھوں پر اٹھائے واپس جھونپڑی میں آ گیا اب وہ سوچوں میں گم تھا۔

مُندری کے کفن کے لیے، قبر کی کھدوائی کے لیے، مولوی صاحب کی خدمت کے لیے اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ بجھی بجھی آنکھوں سے وہ اس کی لاش کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ کیوں نہ ماجھے کی طرح اسے بھی گڑھا کھود کر دبا دے لیکن اچانک ایک اور خیال نے اس کے دل میں کروٹ لی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اٹھا اور ایک پرانے بورے میں مُندری کی لاش ڈال کر اوپر سے گرہ لگا دی...... صبح ہفتے بھر کے جمع شدہ کوڑے کا وزن ہونا تھا...... وہ سوچنے لگا...... بہت کم ہوئی تب بھی دو من تو ہوگی۔

شفیق انجم، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے شعبۂ اُردو میں لیکچرر ہیں۔ ان کا تعلق لکھنے والوں کی اس نئی نسل سے ہے جس نے اکیسویں صدی کے طلوع کے ساتھ اپنے فنی سفر آغاز کیا۔ فکشن کے ساتھ ساتھ ان کی دلچسپی تحقیق وتنقید بھی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی تین کتابیں: ''جائزے''، ''اُردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رُجحانات کے تناظر میں)'' اور ''کلامِ طارق (تدوین)'' شائع ہو چکی ہیں۔ ''میں + میں'' شفیق انجم کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔

vprint.vp@gmail.com 051-5814796

Rs. 120/-